ولادت محمدی ﷺ

ظہور بشارت عظمیٰ

حضرت عیسیٰ علیسلم نے جو بشــارت دی تھی یاتی من بعدِی اسمہ احمد (میرے بعد ایــک رسـول آئے گا جس کانام احمد ہوگا) (۶۱:۶)

۲۵ اپریل ۵۷۱ ءکو اس جان آفریں بشــارت کــا ظہور ہوا ۔

صــبح کـا سـہانا وقت تھــا۔ ابھی سـورج نہیں نکلا تھا کہ ہدایت و رحمت کا یہ آفتــاب افــق مکہ پر طلوع ہوا۔ ربیع الاول کی بارہ تھی۔[5]

نام نامی :

---

[5] مشہور یہی ہے۔ ھذا ھوالمشھور عنـدالجمھور (البـدایہ و النہایہ ۲۶۰ ج۲) مگر مورخین نے ۱۲ کے علاوہ اور تـاریخیں بھی بیان کی ہیں ۔ فلکیات کے مــاہر علامہ محمــود فلکی نے ۹ ربیع الاول صحیح قرار دی ہے ۔ حضرت الاستاذ العلام المحدث مولانا سید انور شـاہ کشـمیری رحمتہ اللہ، ان کے علاوہ علامہ شـبلی حمتللہعلیہ نے بھی علامہ محمــود فلکی کی تحقیق کو تسلیم کیا ہے ۔ یعنی ۹ ربیع الاول ۲۱ اپریل ۵۷۱ ء

اس چہیتے بچے کانام دادا نے "محمد" والدہ نے "احمد" رکھا۔ باپ (عبداللہ) کا انتقال دو مہینے پہلے ہوچکا تھا۔ ❷

والدہ کا نام آمنہ تھا اور دادا کانام عبدالمطلب جو قریش کے سردار اور مکہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے ۔ آمنہ کے باپ کانام وہب تھا پسرعبدمناف پسرزہرہ پسرکلاب پسرمرہ۔ کلاب پرمادری اور پدری دونوں سلسلے جمع ہوجاتے ہیں ۔

رضاعت وشیرخوارگی اور مرضعات

(دودھ پلانیوالی مائیں)

زعم برتری اور خوش حالی کا ایک تکلف یہ تھا کہ بیگمات اپنے بچوں کو خود دودھ نہیں پلاتی تھیں ۔ کچھ عرصہ بچہ ماں کے پاس رہتا تو دودھ پلانے میں خاندان کی عورتیں یا باندیاں مدد کیا کرتی تھیں ۔ پھر بچے کو مستقل طور پر کسی ماما کے سپرد کردیا جاتا تھا ۔

قریش کو اپنی زبان سے عشق تھا۔ وہ شخص قوم کا سردار نہیں مانا جاسکتا تھا جو فصیح نہ

---

❷ وہ تجارتی قافلے میں شام گئے تھے غلہ لینے کے لئے۔۔ واپسی میں جب قافلہ مدینہ پہنچا تو عبداللہ بیمار ہوگئے۔۔ مدینہ کے مشہور قبیلہ بنی عدی بن نجار سے نانہیالی رشتہ تھا ۔ عبداللہ یہیں ٹھہرگئے۔ قافلے والوں نے مکہ پہنچ کر خواجہ عبدالمطلب کو عبداللہ کی بیماری کی خبر دی ۔ عبدالمطلب نے اپنے بڑے لڑکے حارث کو مدینہ بھیجا۔ مگر عبداللہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ دارالنابغہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ پچیس سال عمر ہوئی۔ ترکہ میں بکریوں کا ایک گلہ، پانچ اونٹ ایک باندی "ام ایمن" چھوڑی۔ (طبقات ابن سعد ص ۶۱ ج۱)

ہو۔ بچپن ہی سے زبان کی حفاظت کی جاتی تھی اور بچوں کو فصیح عربی کا عادی بنایا جاتا تھا۔ مکہ شہر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ بچے ٹکسالی فصیح عربی کے عادی ہوں کیونکہ یہ ایک تیرتھ تھا جہاں غیرقریشی عرب جو فصاحت سے ناآشناہوتے تھے، ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ یہاں قیام کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلے میں بھی آمدورفت رہتی تھی اور زبان کے لحاظ سے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ یہاں عجمی (شام اور افریقہ وغیرہ کے غلام) بکثرت رہتے تھے۔ ایک ایک گھرانے میں کئی کئی غلام ہوتے تھے۔ ان کی مخلوط عربی مضحکہ خیز ہوتی تھی اور بچوں کا واسطہ زیادہ تر انہیں غلاموں سے پڑتا تھا۔ اس لئے قریش نے کچھ ایسے دیہاتی قبائل منتخب کررکھے تھے جن کی زبان فصیح مانی جاتی تھی ۔ انہیں قبائل کی عورتوں کو وہ اپنے بچوں کی “ماما” بناتے تھے۔ ان قبائل کی عورتیں مکے میں آتیں اور بچوں کو لے جاتیں ۔ وہی دودھ پلاتیں اور وہی پرورش کرتیں ۔ انہیں کی ٹکسالی عربی کے الفاظ بچوں کے کانوں میں پڑتے ۔ انہیں الفاظ کی ادائیگی کے لئے بچوں کی زبان پہلی مرتبہ پلٹتی اور فصاحت گویا ان کی گھٹی میں پڑجاتی ۔

زبان کی حفاظت کے علاوہ صحت کے لحاظ سے بھی دیہات کی کھلی ہوا بچوں کے لئے مفید ہوتی تھی ۔ اس سماجی رسم کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ بچوں کی نشوونما صحت مندانہ

ہو ۔ اخلاق وخصائل کے لحاظ سے بھی یہ قبیلہ پست نہیں تھے ۔ یتیم عبداللہ کے دور رضاعت کو خاندانی آداب کے اسی سانچے میں ڈھلنا پڑا ۔ چنانچہ آپ کی والدہ نے تو صرف سات یا نو روز دودھ پلایا۔ پھر ابولہب کی آزاد کردہ باندی ثوبیہ نے سات ماہ دودھ پلایا۔ ابولہب کی باندی ثوبیہ نے جب گوشہ جگر عبداللہ کی ولادت کی خبرسنائی تو ابو لہب نے اس خوشی میں اس باندی کو آزاد کردیا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ اور خواتین کے نام بھی لئے جاتے ہیں جنہوں نے دودھ پلایا ۔ اس کے بعد آپ حضرت حلیمہ کے سپرد کئے گئے جو آپ کو قبیلہ بنی سعد میں لے گئیں ۔ کم و بیش چار سال آپ نے اسی قبیلہ میں گزارے ۔

سیّدہ آمنہ مدینہ میں

مدینہ منورہ جس کا نام اُس وقت یثرب تھا۔ سیدہ آمنہ کا وہاں نانہیالی رشتہ تھا۔ حضرت محمد (ص) حلیمہ سعدیہ کے یہاں سے آگئے تو تقریباً تیرہ سال بعد سیّدہ آمنہ مدینہ گئیں ۔ اپنے نورچشم لختِ جگر کو بھی لے گئیں اور خدمت کے لیے متوفی عبداللہ کی باندی "ام ایمن" بھی ساتھ گئیں ۔ وہاں دارالنابغہ میں قیام کیا۔ یتیم عبداللہؑ آمنہ کا لال جس طرح حُسن و جمال میں موتی تھا۔ اُس کی خصلتیں بھی سب بچوں سے نرالی تھیں ۔ ذہین بچے شریر ہوتے ہیں مگر آمنہ کے اس جگر گوشہ میں ذہانت تو کوٹ کوٹ

کر بھری ہوئی تھی، شرارت کا نام نہ تھا۔ ہر بات میں ادب اور تہذیب ہر ایک کام سلیقہ کا۔ بھولی بھولی بات چیت بہت شیریں ۔ سمجھداری اور شرافت ایسی کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ دوسروں سے تذکرہ کرتے وہ اس بچّے کو دیکھنے آتے تھے۔ مدینہ سے دو دو تین تین میل کے فاصلہ پر یہودیوں کی بڑی بڑی بستیاں تھیں ۔ وہاں بڑے بڑے عالم رہتے تھے۔ وہ آنے والے نبی کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے اور اُس کی آمد کے منتظر تھے۔ نجومیوں اور جوتشیوں (کاہنوں) کی باتیں بھی مشہور تھیں ۔ اس بچے کی خبر رفتہ رفتہ ان یہودیوں کو پہونچی تو وہ دیکھنے آنے لگے۔ کوئی دیکھ کر بچے کی تعظیم کرتا اور کوئی ہکا بکا دم بخود رہ جاتا کہ جو باتیں آنے والے نبی کی ہیں وہ اس بچے میں پائی جاتی ہیں ۔ پھر اپنی تنگ نظری سے جزبز ہونے لگتا کہ نبوت تو ہمارے خاندانوں کا حصّہ ہے۔ قریش میں یہ بچہ کیوں پیدا ہوگیا۔ اس طرح کی باتیں ہونے لگیں ۔ سیّدہ آمنہ کو حلیمہ کی بات یاد آگئی کہ وہ ایک یہودی کے پاس اس نونہال کو لے گئی تھیں تو اُس نے شور مچادیا تھا کہ اس بچے کو ختم کر دو ورنہ انقلاب برپا کردے گا، تمہارے مذہب بدل دے گا۔ سیدّہ آمنہ کو فکر ہوئی اُنھوں نے مدینہ کا قیام مختصر کیا۔ صرف ایک مہینہ ٹھہریں ۔ پھر اپنے آنکھوں کے نور، دل کے سرور کو لے کر مکّہ روانہ ہوگئیں۔ لیکن اس یتیم بچے کی انوکھی بات یہ بھی تھی کہ قدرت

نے ابھی سے اس کو آزمانا شروع کردیا تھا۔ سیّدہ آمنہ مدینہ سے چلیں تو طبیعت خراب ہوگئی۔ اب جیسے جیسے قافلہ چل رہا تھا، اُن کا مرض بڑھ رہا تھا۔ ایک مقام ابواءتھا۔ وہاں قافلے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ جب سیّدہ آمنہ یہاں پہونچیں تو مرض اور بڑھ گیا۔ آگے چلنے کی ہمت نہیں رہی، مکہ کے بجائے آخرت کے لئے رختِ سفر باندھ لیا اور دنیا سے رخصت ہوگئیں ۔ یہیں اُن کو سُپرد خاک کردیا گیا۔ "ام ایمن" ساتھ تھیں ۔ وہ اس یتیم کو جو اب یسیر بھی ہوگیا تھا، لے کر مکہ معظمہ آئیں ۔ دادا کو خبر ہوئی تو بہت صدمہ ہوا۔

اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب آنحضرت ﷺ ہجرت کرکے مدینہ پہونچے تو آپ ﷺ کو بچپن کی باتیں یاد تھیں ۔ آپ بتایا کرتے تھے کہ یہاں ہم ٹھہرے تھے۔ یہاں والدہ کا قیام ہوا تھا۔ یہودی مجھے آ آکر دیکھا کرتے تھے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ "بنی عدی بن نجار" کے محلہ میں ایک بادلی تھی، میں اُس میں تیراکی کی مشق کیا کرتا تھا۔ ام ایمن بیان کرتی تھیں کہ مجھے خوب یاد ہے۔ یہودی کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ اس اُمت کا نبی ہوگا، مکہ سے ہجرت کرکے آئے گا یہ اس کا دارالہجرت ہے۔[۵]

دادا عبدالمطلب کی سرپرستی اور وفات

۵ طبقات ابن سعد ج۱، ص ۷۳

یہ غم زدہ معصوم مکہ معظمہ پہنچا تو عبدالمطلب نے اپنے یتیم ویسیر پوتے کو چھاتی سے لگایا اور اپنے ساتھ رکھنے لگے۔

یہ معصوم بھی دادا سے لگ گیا اور اتنا کھل گیا کہ ان کے پاس جاتا تو بلاتکلف ان کی گدی پر بیٹھ جاتا تھا۔ خانہ کعبہ کی دیوار کے نیچے ان کے لئے فرش بچھایا جاتا تھا۔ فرش پر عبدالمطلب بیٹھتے اور کنارے پر لڑکے بیٹھاکرتے تھے ۔ مگر یہ معصوم "محمد" آگے پہنچ جاتے تھے۔ چچا تائے منع کرتے تھے لیکن عبدالمطلب خوش ہوتے اپنے پاس بٹھالیتے ۔ کمر پر ہاتھ پھیرتے اورفرمایا کرتے تھے یہ میرا بیٹا بہت بڑا آدمی ہوگا ۔ اس کی خاص شان ہوگی۔[2] یہودی کہتے ہیں کہ یہ نبی ہوگا۔[3] اُم ایمن جن کو برکت کہتے تھے ان کو تاکید کیا کرتے کہ دیکھو برکت! میرے محمد کا ہروقت خیال رکھا کرو، کہیں باہر نہ جانے دیا کرو۔[4]

لیکن عبدالمطلب چراغ سحری تھے۔[5] سوسال سے بھی زیادہ عمر ہوچکی تھی۔ صرف دوسال پوتے کی دیکھ بھال کرسکے پھر ان کی وفات ہوگئی ۔ ام ایمن کہاکرتی تھیں کہ اس روز میں

---

[2] سیرت ابن ہشام ص ۱۰۶

[3] طبقات ابن سعد ص ۴۵، ج۱

[4] ایضاً ص ۷۵

[5] ایک روایت ہے کہ ایک سودس سال اور دوسری روایت میں ہے کہ ایک سو بیس سال عمر ہوئی ۔ یہ بھی روایت ہے کہ بیاسی سال عمر ہوئی حجون میں دفن کیاگیا ۔ طبقات ص۷۵ ج۱

نے دیکھا کہ جنازے کے پیچھے "محمد" روتے جارہے تھے۔( )

آنحضرتﷺ سے پوچھا گیا : آپ کو دادا کی وفات یاد ہے؟ فرمایا خوب یاد ہے۔ میری عمر اس وقت آٹھ سال تھی [6]

خواجہ ابوطالب کی سرپرستی

عبدالمطلب نے زندگی کے آخری ایام میں ہی یتیم عبداللہ کو ابو طالب کے سپرد کیا۔ ابوطالب کو پہلے سے بھی اس بھتیجے سے محبت تھی اب یہ محبت اور بڑھ گئی بقول [1] ابن عباس (رضی اللہ عنہ) اپنی اولاد سے زیادہ اس بھتیجے سے محبت کرتے تھے ۔ ابو طالب کو ایسی محبت کبھی کسی سے نہیں ہوئی تھی ۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ کہیں جاتے تو ساتھ لے جاتے ۔ رات کو اپنے پاس لٹاتے تھے۔ دسترخوان بچھ جاتا سب بچے بیٹھ جاتے مگر ابوطالب اس وقت تک نوالے نہ توڑتے جب تک ان کا چہیتا "محمد" نہ آجاتا تھا۔ محمد کی باتیں بھی ایسی تھیں کہ ابو طالب کے دل کو لبھاتی رہتیں ۔ دسترخوان پر جب بچے اکٹھے ہوتے تو چیخ وپکار اور چھین جھپٹ کرتے مگر یہ بھولے صاحبزادے "محمد" خاموش بیٹھے رہتے ۔ کبھی ایسا ہوتاکہ انہیں کچھ بھی نہ ملتا، دوسرے بچے ہی جھپٹ لیتے تھے۔ ابوطالب نے محمد کا کھانا

---

[6] طبقات ابن سعد ص ۷۵ ج ۱

[1] بدایہ ونہایہ ص ۲۸۲ ج۲

الگ کردیا[2] مگر یہ بات محمد کی فطرت کے خلاف تھی کہ الگ کھائیں یا کوئی چیز ان کو مل جائے اور دوسروں کو نہ ملے۔ اس لئے الگ کھانے پر محمد راضی نہ ہوئے سب کے ساتھ ہی کھاتے اور اپنے کھانے سے زیادہ دوسروں کے کھانے سے خوش ہوتے۔ کبھی خود اپنے پاس سے اٹھاکردیتے تھے ۔

علماءسیرت وتاریخ کا ایک متفقہ بیان ہے، اس موقع پر اس کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے :

محمدﷺ اس کردار کے ساتھ جوانی کی منزل پر پہنچے کہ زمانہ جاہلیت کی باتوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ کو محفوظ رکھا ۔ آپ ایسے نوجوان تھے کہ مروت میں سب سے افضل، شرافت کی باتوں میں سب سے اعلیٰ ، اخلاق میں سب سے بہتر، میل جول میں نہایت شریف، جواب دینے میں نہایت مہذب اور باسلیقہ، گفتگو نہایت شیریں ، سمجھ بوجھ میں سب سے برتر، نہایت بردبار، نہایت امانت دار، بات کے سچے، زبان کے پکے، ہرایک برائی سے کوسوں دور، ہر ایک کے خیرخواہ، کبھی کسی کو آپ سے تکلیف نہ پہنچی، کبھی کسی کو سخت بات نہیں کہی، نہ کسی سے لڑائی نہ کسی سے جھگڑا کیا۔ انہیں خوبیوں نے آپ کی قوم کو آپ کا گرویدہ بنادیا ۔ آپ کی سچائی اور امانتداری نے لوگوں میں جذبہ پیدا کیا کہ آپ کو الامین (الصادق) کہیں اور اسی نام سے آپ کو یاد کریں ۔

---

[2] بدایہ و نہایہ ص ۲۸۲ ج۱

اپنا تکفل خود اور دوسروں کی مدد

اپنی زندگی خود بناؤ، اپنا بوجھ خود سنبھالو، دوسروں کی مدد کرو ۔

عبدالمطلب کی وفات کے بعد ابو طالب ان کے جانشین بنائے گئے۔ قبیلے کے شیخ اور مکے کے ایک سردار مانے گئے ۔ اس لحاظ سے عزت تو کافی تھی مگر دولت ناکافی ۔ بڑا کنبہ، عیال کثیر آمدنی کا ذریعہ محدود، یتیم عبداللہ (محمدﷺ) آپ کے سپرد ہوئے تو اگرچہ یہ یتیم عمرعزیز کی ابھی آٹھویں منزل ہی طے کررہا تھا مگر چچا کی پریشان حالی کے احساس نے اس کو اس ننھی سی عمرمیں ہی فکر مند بنادیا ۔ وہ سوچنے لگا کہ اپنے مربی چچا کی مدد وہ کس طرح کرسکتا تھا۔ مگرمکے میں نہ کوئی دستکاری تھی نہ کوئی سرکار جس کی نوکری کی جاسکے ۔ اس زمانے کی دنیا کارخانوں سے بھی آشنا نہ تھی اور مکے کی پتھریلی اور ریتلی زمین اور آس پاس کے جھلسے ہوئے کالے اور بھوسلے پہاڑوں کو کسی چشمے یا دریا کی سیرابی بھی میسر نہ تھی کہ وہاں کھیتی باڑی ہوسکے۔ البتہ بھیڑبکری اور اونٹ یہاں بکثرت تھے اور قدرت نے ان کا چارہ یعنی ببول کے درخت اور اذخرجیسی گھاس بھی وہاں پیدا کی تھی۔ انہیں مویشی کے گلے اس زمانے کی قیمتی دولت تھے اور جن کے پاس یہ دولت ہوتی تھی وہ ان کے چرانے اور دیکھ بھال کے لئے مزدور اور اجیربھی رکھاکرتے تھے ۔ یہ گلے بانی سوسائٹی

کی نظر میں کچھ بھی حیثیت رکھتی ہو مگر آمدنی اور گذرکا ایک جائز ذریعہ تھی۔ سردار قریش عبدالمطلب کے یتیم پوتے محمد ﷺ نے اسی ذریعے کو اختیار کیا اور اس کے ننھے سے وجود کے لئے اونٹوں کی گلہ بانی مشکل تھی تو بکریاں چرانے کی مزدوری کرنے لگے ۔ اس طرح اپنی زندگی خود بنالی ۔ اور نہ صرف یہ کہ اپنا بوجھ خود سنبھالا بلکہ پریشان حال چچا کی مدد بھی کرنے لگے۔

مکہ تجارتی نقطہ نظر سے :

مکہ کی زمین اگرچہ پیداوار کے قابل نہیں تھی مگر تجارتی کاروبار کے لئے نہایت موزوں تھی ۔ یہاں مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملتے تھے۔ ایران و عراق ،یمن، شام اور افریقہ کے تجارتی تعلقات کی درمیانی کڑی یہی شہر تھا ۔ قریش اس قدرتی نعمت کو پہچانتے تھے اور جہاں تک ان کی گنجائش تھی وہ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے ۔

بعثت نبوی (آنحضرت ﷺ کے نبی بنائے جانے) سے تقریباً دوسو برس پہلے قریش کے مشہور اور ممتاز سردار ہاشم نے رحلۃ الشتاءوالصیف (سردی اور گرمی کے موسم کے دو کوچ) کا دستور ڈال دیا تھا۔ گرمیوں میں مکے والوں کے تجارتی قافلے شام اور انقرہ جاتے تھے جہاں اس زمانے میں ٹھنڈ ہوتی تھی۔ وہ خوشگوار موسم، صحت بخش آب و ہوا کا لطف بھی اٹھاتے

اورتجارت بھی کرتے تھے، اور سردیوں میں یہ قافلے حبشہ اور یمن جاتے تھے۔ ہاشم اور اس کے بھائیوں نے مختلف ممالک سے عربوں کے لئے آزاد تجارت کے سرٹیفکیٹ (پروانے) بھی حاصل کرلئے تھے ۔ عرب میں قریش کی عظمت کا ایک بڑا سبب یہ تجارتی اقتدار بھی تھا ۔

حضرت محمد ﷺ کی عمرنے ترقی کی اور اس قابل ہوئے کہ تجارتی قافلے کے ساتھ سفر کرسکیں تو آپ نے اس شریف پیشہ کو اپنانا چاہا۔ لیکن روپیہ آپ کے پاس نہیں تھا تو آپ نے دوسروں کے سرمایہ سے تجارت شروع کردی ۔ بیرونی تجارت میں بھی حصہ لیا اور جیساکہ (عبداللہ بن ابی الحمس) کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مکہ میں گھوم پھر کر بھی کاروبار کرتے تھے ۔ تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے ۔ یہی دور تھا جب آپ نے چچا ابو طالب کی مستقل مددیہ کی کہ نونہال "علی" کے مصارف سے ان کو سبکدوش کردیا۔ ان کو اپنے ساتھ رکھا اور جملہ مصارف کے ذمہ دار خود ہوگئے ۔

قومی خدمت کا جذبہ:

بچپن کا یہی معصوم دور جس کی خود داری نے اس معصوم نونہال کو گلہ بانی پر آمادہ کیا تھا، فطری طور پر قومی خدمت کے جذبہ سے معمور تھا ۔ کعبہ عربوں کا قومی اور مذہبی نشان تھا چونکہ وہ پہاڑوں کے نشیب میں واقع

ہے تـوجب بھی زور دار بـارش ہوتی تھی سـیلاب کی دھاریں اس کو چھـوتی رہتی تھیں اور کبھی کبھی اس کو نقصان پہنچادیا کرتی تھیں ۔

مکہ اگرچہ ساحل سـمندر سـے صـرف چـالیس میل کے فاصلہ پر ہے مگـر مـون سـون اس طـرف نہیں جاتـاہ برسـات تـو وہاں ہوتی ہی نہیں ۔ بـارش بھی کبھی کبھی ہوتی ہے ۔ بسـا اوقـات کئی سال گزر جاتے ہیں بارش کی ایک بوند نہیں برسـتی اور کبھی ایسـی زور دار برسـتی ہے کہ مکہ میں طوفـان آجاتـا ہے ۔ اس وقت کـا ایـک واقعہ ہے جب آنحضـرت ﷺ کی عمـر تقریبـاً دس سال ہوگی کہ مکہ کے پہاڑوں پـر زور دار بـارش ہوئی پھر سـیلاب بھی ایسـا زور کـا آیـا کہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچ گیا ۔ سـیلاب اتـرا تـو کعبہ کی مرمت شروع کی گئی ۔ سن رسیدہ اور نوجوان رضاکار اپنے اس قومی نشـان کی مـرمت کررہے تھے تـو لوگـوں نے دیکھـا کہ ایـک بچہ بھی نوجوانوں کی طرح سرگرم ہے اور اگـرچہ بسـاط کچھ بھی نہیں مگر جذبہ اور شوق کا یہ عالم ہے کہ بھاری بھـاری پتھـر مونـڈھے پـر اٹھارہاہے اور کعبہ کی دیوار تک پہنچا رہا ہے ۔ مونڈھے پتھروں سے چھلے جارہے ہیں ، بـوجھ اٹھـانے سـے سـانس چڑھ رہا ہے مگـر اس کے ولـولے میں کـوئی فـرق نہیں آرہا ہے ۔

اور یہ بہادر بچہ وہی ہے جســـے "محمد" کہا جاتا ہے(۱)

شرم و حیا:

اس فلمی دور میں شرم و حیا ایک مذاق کی چیز بن گئی ہے ، مگر دنیائے اخلاق میں یہ بہت قیمتی چیز ہے کیونکہ یہ درحقیقت اس خصلت کا نام ہے جو انسان کو ایسی باتوں سے روکے جو انسانیت اور شرافت کی نظرمیں معیوب مانی جاتی ہیں ۔

سیدنا محمد ﷺ کی فطرت کو جو شرم و حیا کی جنس گراں مایہ عطا ہوئی تھی اس کا ایک نمونہ اس موقع پر دیکھنے میں آیا ۔

کعبہ کی مرمت کے سلسلے میں جب آپ پتھر اٹھارہے تھے تو آپ کے چھوٹے چچا عباس جو آپ سے دوسال بڑے تھے وہاں موجود تھے انہوں نے دیکھا کہ بے ڈول اور نوکیلے پتھروں سے ان کے معصوم بھتیجے محمد کے مونڈھے چھلے جارہے ہیں ۔ نیم وحشی عربوں میں برہنگی زیادہ معیوب نہیں تھی وہ بسا اوقات اپنے عقیدے کے مطابق حج جیسے مقدس فرض ادا کرتے ہوئے خانہ کعبہ کے قریب (جوان کے نزدیک سب سے زیادہ واجب الاحترام مقام تھا) مادر زاد برہنہ ہوجاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ جن کپڑوں میں سال بھر گناہ کرتے رہے ہیں انہیں کپڑوں میں یہ مقدس فرض انجام دینا صحیح نہیں ہے۔ بہرحال عباس کو بھولے بھالے معصوم بھتیجے پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کوئی کپڑا بھتیجے کے مونڈھے پر ڈال دیں ، کوئی اور کپڑا نہیں ملا تو اپنے یہاں کے عام دستور کے مطابق انہوں نے ارادہ کیا کہ بھتیجے

کی لنگی کھول کر مونڈھے پر رکھ دیں ۔ مگر
اتنی سی برہنگی بھی اس شرمیلی اور
باحیافطرت کے لئے ناقابل برداشت تھی جو
حضرت محمد ﷺ کو عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابھی
لنگی کھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس برادرزادے
سعید کی حالت غیر ہونے لگی، چہرے پرسوائیاں
اڑنے لگیں اور ایک ایسی اضطرابی صورت پیدا
ہوگئی کہ عباس گھبرا گئے اور لنگی جوں کی
توں باندھ دی ۔

غیراللہ کی پرستش سے پرہیز :

یہ عجیب بات ہے کہ مکے کے باشندے بے دینی
اور مذہب سے آوارہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو
مذہبی سمجھتے تھے ۔ حضرت ابراہیم علیسلم
کی شخصیت عیسائیوں اور یہودیوں کے نزدیک
مسلم تھی، کیونکہ عیسائی اور یہودی جو عام
طور پر بنی اسرائیل تھے، حضرت ابراہیم
علیسلمکے چھوٹے فرزند حضرت اسحاق علیسلم
کی اولاد میں سے تھے ۔ وہ جس طرح حضرت
ابراہیم علیسلم کو نسلی اعتبار سے مورث اعلیٰ
مانتے تھے، ایسے ہی مذہبی اعتبار سے بھی ان کو
اپنی ملّت کابانی مانتے تھے۔ یہی حال اس زمانے
میں عربوں کا بھی تھا، کیونکہ عرب عموماً اور
قریش خصوصاً حضرت ابراہیم علیسلم کے بڑے
فرزند یعنی حضرت اسماعیل علیسلم کی اولاد
تھے ۔ اس نسلی رشتے کے علاوہ خانہ کعبہ اور
خود مکہ شہر حضرت ابراہیم علیسلم اور حضرت

اسماعیل علیسلم کی تاریخی یادگار تھے۔ قریش
خانہ کعبہ کے محافظ اور متولی بھی تھے جس
کی بنا پر تمام عرب ان کی تعظیم کرتے تھے ۔
اس لحاظ سے مکہ والوں کے لئے مذہبیت ایک
لازمی چیز تھی۔ مگر ان کی یہ مذہبیت شرک
اور اوہام پرستی کا جال بن کر رہ گئی تھی۔
ایک طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا نام زبان
پر تھا جنہوں نے شرک کے خلاف توحید کا جھنڈا
بلند کیا تھا ۔ اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ
حرم کعبہ میں تین سوساٹھ بت رکھے ہوئے تھے
اور ان کے علاوہ ہر ایک قبیلہ کا دیوتا اور اس کا
بت الگ تھا ۔

شرک کی اس گرم بازاری میں کسی بچہ کا
غیراللہ کی پرستش سے بچنا ناممکن تھا۔ مگر
جس کو قدرت نے وہ سنجیدگی عطافرمائی تھی
جس نے اس کو کھیل، تماشہ اور قصہ گوئی کی
محفلوں سے الگ رکھا۔ جو برہنگی کے تصور سے
بھی لرزجاتا تھا ۔ وہ عبادت کے معاملہ میں یہ بے
جوڑ بات اور یہ مذاق گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ
ایک طرف حضرت ابراہیم علیسلم کی توحید
پرستی کے قصے سنے اور دوسری طرف اپنی
پیشانی غیراللہ کے سامنے جھکادے ۔ ایک وقت
اپنے ہاتھ سے مورتی بنائے اور دوسرے وقت اسی
مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک دے ۔ چنانچہ
آنحضرتﷺ کے متعلق یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ
کبھی آپ کی گردن غیراللہ کی عبادت کے لئے
نہیں جھکی ۔

جس فطرت سلیم نے حضرت ابراہیم علیسلم کو سمجھادیا تھا کہ چاند سورج اور آسمان کے چمکدار تارے جن کو ان کی قوم معبود مانتی ہے ہرگز قابل پرستش نہیں ہیں ۔ کیونکہ انسان کی طرح رات دن کی تبدیلیوں کا ان پر بھی اثر ہوتا ہے بلکہ وہ انسان سے زیادہ پابند اور بے بس نظرآتے ہیں ۔ جو پابند ہو اور جس پر رات دن کی تبدیلیوں کا اثرہوتا رہتا ہو وہ معبود نہیں ہوسکتا۔

اسی فطرت سلیم نے پاک طینت محمدﷺ کو ہوش سنبھالتے ہی بتادیا تھا کہ جس کو انسان خود بنائے وہ معبود نہیں ہوسکتا نہ اس قابل ہوسکتا ہے کہ انسان اس کے سامنے گردن جھکائے یا ماتھا رگڑے ۔

بتوں کو چھونے سے پرہیز :

لوگ خانہ کعبہ کا طواف جب بھی کیا کرتے تھے وہاں پیتل کے دو بت[1] اساف اور نائلہ تھے۔ طواف کرنے والے ان کو بوسہ دیا کرتے تھے اور ان پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے چہیتے غلام زید بن حارثہ نے اپنے بیٹے حضرت حارثہ کو واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ بچپن میں آنحضرتﷺ

[1] ۱یہ مرد اور عورت کے دو مجسمے ساتھ ساتھ تھے جن کو پوجا کرتے تھے اور ان پر بھینٹ چڑھایاکرتے تھے روایت ہے کہ خاص کعبہ مکرمہ میں فحش حرکت کرتے ہوئے مسنح کردیئے گئے تھے۔ عجائب پرستی کی انتہا تھی کہ جب پتھر بن گئے تو انکی پوجا شروع کردی گئی ۔ (اخبار مکہ۔ا زرقی ص ۱۲۱ ج ا)

کے ساتھ طواف کررہا تھا ۔ چکرلگاتے ہوئے جب ہم اساف اور نائلہ کے پاس پہنچے تو میں نے چاہا کہ میں بھی انہیں چھولوں ۔ حضرت محمد نے منع فرمادیا۔ اگلے چکر میں میں نے نظربچاکر چھولینا چاہا اور چھوبھی لیا ۔ مگر آپ کی جیسے ہی نظرپڑی آپ نے سختی سے ڈانٹا کہ میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا ۔❷

دور شباب اور جوہری کردار

تجارت:

نوخیز و نوجوان محمدﷺ گلہ بانی سے آگے بڑھ کر میدان تجارت میں آئے تو آپ کے تعلقات وسیع ہوئے ۔ لوگوں کو آپ کے آزمانے اور پرکھنے کا موقع ملا ۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے آپﷺ کو زیادہ قریب سے دیکھا وہی آپﷺ کے سب سے زیادہ گرویدہ ہوگئےہیں اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ صرف دس بارہ سال کے عرصہ میں آپ کی غیرمعمولی امانت داری، راستبازی اور سچائی

---

❷ ہدایہ ونہایہ ص ۲۸۸ج ۲ بروایت بیہقی

نے سب ہی مکے والوں کو یہاں تک موہ لیا کہ وہ آپ کا نام لینا بے ادبی سمجھنے لگے ۔ یہی مکے کے بڑے بڑے تاجر اور سیٹھ جن کو اپنی دولت پر ناز تھا جن کو اپنے بین الاقوامی تعلقات پر فخر تھا کہ ان کے تجارتی قافلے شام، یمن ، فارس وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ افریقہ کے بازاروں میں ان کا لین دین رہتا تھا۔ ان ملکوں کے امیروں اور بادشاہوں سے ان کی راہ و رسم تھی، ان سے اپنی بات منواسکتے تھے ۔ یہی رؤساءقریش جو اپنے سوا کسی کو نظر میں نہیں لاتے تھے، جو دوسروں کی گردنیں اپنے سامنے جھکوانا چاہتے تھے، جن کے مشاعروں کی جان ان کے وہ فخریہ قصیدے ہوا کرتے تھے، جن میں وہ اپنی عظمت اور بڑائی کے ترانے گاتے اور کوئی ان کی توڑ کرتاتھا تو لڑپڑتے تھے ۔ یہاں تک کہ خونریز جنگ کی نوبت آجاتی تھی ۔ دنیا جانتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ یتیم عبداللہ کی غیرمعمولی سچائی اور امانت داری نے ان سیٹھوں اور رئیسوں کو یہاں تک متاثر اور گرویدہ بنادیا تھا کہ وہ آپ کو "الصادق" یا "الامین" ہی کہتے تھے اور نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے ۔ یہ دو لفظ یہاں تک زبانوں پر چڑھ گئے کہ انہوں نے قومی لقب کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

مؤرخ حیران رہ جاتا تھا کہ وہ کردار اور وہ کیرکٹر کس درجے بلندہوگا جس نے تیس بتیس سال کی عمر کے نوجوان کو اتنا اونچا اٹھادیا کہ بڑے بڑے لوگوں کی گردنیں اس کی صداقت و

امانت کے سامنے جھک گئیں ۔ ممکن ہے خاندانی رقابت کے سبب سے کچھ لوگ اس خطاب کو پسند نہ کرتے ہوں لیکن وہ مجبور تھے کہ آپ کو اس خطاب سے یاد کریں ۔ کیونکہ کوئی ایسی بات یا کوئی ایسا بہانہ ان کو نہیں ملتا تھا کہ وہ تردید کرسکیں اور عوام کے جذبات کا مقابلہ کرسکیں ۔

تاریخ کی یہ پرانی عادت بہت ہی تکلیف دہ اور مایوس کن ہے کہ کسی شخص کے واقعات قلمبند کرنے کے لئے وہ اسی وقت قلم اٹھاتی ہے جب وہ شخص تاریخی انسان بن چکتا ہے ۔ اس سے پہلے اس کے قلم کو جنبش نہیں ہوتی ۔ اس نے محمد رسول اللہؐ کے بارے میں بھی اسی بخل سے کام لیا اور ان تمام واقعات سے دامن سمیٹے رکھا جو نبوت سے پہلے محمدؐ کی روز مرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے، جو قریش کے گردن درازوں کو متاثر کرتے رہے۔ تب بھی چند واقعات ایسے ہیں جو کسی طرح تاریخ کے سکڑے ہوئے دامن میں پڑگئے اور تاریخ نے ان کو صحیح سندوں کے ساتھ محفوظ رکھا ۔ قیاس کرنے کے لئے یہ واقعات ہی کافی ہیں اور ان سے قبل نبوت کی زندگی روشنی میں آجاتی ہے ۔

عبداللہ بن ابی الحمساءعامری ایک معمولی آدمی تھے۔ اگر آنحضرتؐ کے ساتھ اس کا یہ معاملہ نہ ہوا ہوتا جو یہاں ذکر کیا جارہا ہے تو دنیا نہ اس کو پہچانتی اور نہ پہچاننے کی ضرورت محسوس کرتی ۔

یہ عبداللہ حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ سے کوئی سودا کررہا تھا۔ بات چیت کرتے ہوئے اسے کوئی کام یاد آگیا۔ اس نے حضرت محمد ﷺ سے کہا : آپ ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں ، تب بات کروں گا ۔ آپ کی زبان سے نکل گیا : اچھا۔

اب بات کی پختگی اور زبان کی پابندی ملاحظہ فرمائیے ۔

عبداللہ بن ابی الحمساء یہاں سے چلا تو اس کو کوئی اور ضرورت پیش آگئی وہ اس میں ایسا لگا کہ اس کو اپنے وعدے کا خیال بھی نہ رہا ۔ یہ دن یونہی گزر گیا ۔ پھر اگلا دن بھی گزرگیا ۔ تیسرے دن اسے خیال آیا کہ میں محمد بن عبداللہ ﷺ سے معاملہ کررہا تھا یہ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی ۔ میں ان کو ٹھہراکر آیا تھا ۔ اب چل کر بات پوری کرلینی چاہئے ۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی الحمساء آپ کے مکان پر پہنچا معلوم ہوا کہ دوروز گزرگئے آج تیسرا دن ہے وہ مکان پرنہیں آئے ۔ گھر والے خود پریشان ہیں ۔ عبداللہ بن ابی الحمساء یہاں سے روانہ ہوا۔ جہاں جہاں خیال تھا سب جگہ آنحضرت ﷺ کو تلاش کیا ۔ کہیں نہ ملے تو احتیاطاً اس جگہ بھی پہنچاجہاں بات چیت ہورہی تھی اور وہ آپ کو وہاں ٹھہراکر آیا تھا ۔

عبداللہ بن ابی الحمساء اس مقام پر پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ محمد بن عبداللہ ﷺ وہیں موجود ہیں ، عبداللہ بن ابی الحمساء کا انتظار کررہے ہیں ۔ اورزیادہ حیرت

اس کو اس بات پر ہوئی کہ مسلسل تین دن تک انتظار کی زحمت اٹھانے کے بعد بھی جب عبداللہ بن ابی الحمساءسامنے آئے تو نہ لڑائی جھگڑا تھا نہ ڈانٹ ڈپٹ کہا تو صرف اتنا کہا اور وہ بھی دھیمی آواز سے یافتی لقد شققت علیَّ انا ھھنا منذ ثلاث انتظرک[۱] (اے صاحب! آپ نے پریشان کردیا ، تین دن ہوگئے یہاں آپ کا انتظار کررہا ہوں ۔)

کہہ سکتے ہیں کہ وعدے کی یہ صداقت اور پختگی وہ متبرک ترکہ تھا جو آپ کو اپنے جدا علیٰ حضرت اسماعیلعلیسلم سے ملا تھا سید نا اسماعیل علیسلمسے بھی ایک شخص نے کہا تھا کہ آپ یہاں ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں وہ اپنے کام میں لگ کر بھول گیا اور حضرت اسماعیل علیسلم وعدے کی پابندی کی بناءپر وہیں ٹھہرے رہے ۔ وہ تیسرے دن جب اس کو یاد آیا اور وہاں پہنچا تو حضرت اسماعیل علیسلم اسی جگہ انتظار کررہے تھے۔ حضرت اسماعیل علیسلم کا یہ وصف یہاں تک مقبول ہوا کہ وحی الٰہی نے حضرت اسماعیل علیسلمکی خصوصیات میں اس کو شمار کرایا ہے ۔ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم۔۵۴) آنحضرتﷺ کے اوصاف الگ الگ وحی الٰہی نے شمار نہیں کرائے بلکہ ایک جامع اور مکمل سندیہ دیدی : وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ۴﴿(قلم۔ ۴) ، یعنی اخلاق کی مثالیں جو انبیاءعلیمسلمکے تذکرے

---

[۱] ابو داؤد شریف باب فی العدة کتاب الادب۔

میں الگ الگ بیان کی گئیں آپ ان سب کا مکمل مجموعہ ہیں ۔

قیس بن سائب بن عویمر ایک صحابی تھے۔ اس زمانہ میں جب آپ کاروبار کیاکرتے تھے وہ آپ کے شریک اور ساجھی رہے تھے۔ وہ ہمیشہ تعریف کیاکرتے تھے اور کہا کرتے تھے:

كان رسول الله ﷺ شريكى فى الجاهلية فكان خيرشريك لا يدارى ولا يمارى ۔

"محمد ﷺ جب نبی نہیں بنائے گئے تھے (زمانہ جاہلیت میں) میرے ساجھی تھے۔ بس بہت ہی اچھے ساتھی تھے۔ نہ کبھی سخت بات کہتے تھے نہ جھگڑتے اور بحث کرتے تھے۔

یہ کاروباری سلسلہ کی باتیں تھیں ۔ اب ہمدردی نوع انسان اور احترام انسانیت کی ایک مثال مطالعہ فرمایئے جو اس زمانہ میں بھی اپنی نظیر آپ تھی اور تہذیب کی دعویدار موجودہ دنیا بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے ۔

بردہ فروشی عرب میں عام تھی اور بسا اوقات شریف گھرانوں کے بچے بھی اس شکنجہ میں کس لئے جاتے تھے۔ چنانچہ قبیلہ بنی القین بن جسر کے آدمی ایک لڑکے کو پکڑ لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادر زادہ "حکیم بن حزام بن خویلد" کے ہاتھ بیچ دیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے بھتیجے کے یہاں گئیں تو یہ غلام ان کو پسند آگیا ۔ انہوں نے فرمائش کی اور بھتیجے نے یہ غلام پھوپھی کی

نذر کردیا ۔ حضرت محمدﷺ کی نظر اس پر پڑی تو اس کی معصوم زندگی اور اس کی مظلومیت سے دل بے چین ہوگیا ۔ آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس کو خریدلیا۔ پھر بچے سے اس کے ماں باپ کا نام اور خاندان و قبیلہ کا پتہ دریافت کیا۔ بچہ ذہین تھا اس نے برجستہ جواب دیا : میرانام زید، میرے والد حارثہ بن شرجیل بن کعب اور والدہ سعدی بن ثعلبہ ہیں اور قبیلہ طے کے خاندان بنی معن سے ہمارا تعلق ہے ۔ آنحضرتﷺ کو اس کے باپ کا نام اور پتہ معلوم ہوگیا تو اس کے والد کو خبر پہنچائی۔ والد حارثہ خبر پاتے ہی اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مکہ آگیا اور دریافت کرتا ہوا حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچا۔ بچے کو دیکھا ، چوما،پیار کیا گلے لگایا اور شفقت پدری کے بموجب یہ چاہا کہ اپنے لخت جگر، نور چشم کو ساتھ لے جائے اور حضرت محمدﷺ کی خدمت میں کچھ رقم بطور فدیہ پیش کردے ۔ آنحضرتﷺ نے رقم لینے سے تو انکار کردیا اور اس کی اجازت دیدی کہ بچے کو اپنے ساتھ لے جائیں ۔ البتہ یہ فرمادیا کہ خود بچے سے بھی دریافت کرلیں کہ وہ آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے ۔

بچہ آپ کے یہاں آیا ۔ اس کے والد کو اس زمانہ کے ذرائع اور وسائل کے بموجب خبر دی گئی۔ وہ اپنے علاقہ طے سے سفر کرکے یہاں آیا اس میں کچھ دن لگ گئے۔ بچہ اس عرصہ میں حضرت محمد کی شفقتوں سے اتنا مانوس ہوگیا تھا کہ

اس کو آپ سے جدا ہونا گوارا نہ ہوا ۔ اس نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ باپ نے بہت سمجھایا مگر بچہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ آخر میں باپ اور چچا نے چبھتی ہوئی بات کہی : بیٹا تم غلام ہو، غلام رہنا پسند کرتے ہو، باپ کے ساتھ آزاد رہنا پسند نہیں کرتے ۔

آنحضرت ﷺ نے اب تک باپ بیٹے کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا ۔ مگر یہ بات ایسی تھی جس کا تعلق آنحضرت ﷺ کے سلوک اور آپ کے انداز فکر سے تھا ۔ کیا واقعی زید کو آپ غلام سمجھتے ہیں ۔ زیدکو غلام کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں ۔ کیا آپ کسی آزاد بچے کے لئے غلامی پسند کرتے ہیں ۔ چنانچہ آپ نے فوراً باپ بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا : غلام نہیں بیٹا ۔ زید میرے پاس رہے گا تو بیٹا بن کر ۔ میں تمہارے سامنے یہ کہتا ہوں اور تمہیں اس سے اطمینان نہ ہوتو چلو، مجمع میں یہ اعلان کئے دیتا ہوں ۔ چنانچہ آپ باپ چچا اور زید کو لے کر ایک چوپال میں پہنچے، جہاں قریش کے سردار اور چودھری موجود تھے اور آپ نے اعلان فرمادیا کہ : زید میرا بیٹا ہے میں اعلان کرتا ہوں آپ لوگ گواہ رہیں ۔

حارثہ (زید کے باپ) کی یہ آخری تدبیر تھی۔ زید کو پھسلانے کی جو قطعاً ناکام رہی ۔ اب حارثہ کوکہناپڑا : اچھا آپ بیٹا بناکر رکھتے ہیں تو مجھے بھی عذرنہیں ۔ فطرت محمد(ﷺ) کی یہ بلندی بھی نظرانداز نہ ہونی چاہیے کہ آپ نے عبدِ

محمد (محمد کا غلام) کہلانا پسند نہیں کیا۔ آپ نے "ابن محمد" کہلایا اور اسی نسبت سے ان کی شہرت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اس واقعہ سے تقریباً ۳۰ سال بعد آیت نازل ہوئی: اُدْعُوهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ (احزاب۔۵) ۔[1]

محمدؐ کا یہی کردار تھا جس نے سرداران قریش کی گردنیں اس کی تعظیم کے لئے خم کیں۔ یہاں تک کہ نام لینا بے ادبی سمجھتے اور "الصادق" اور "الامین" کے خطاب آپ کے لئے عام ہوگئے۔

آپ کے مربی چچا ابو طالب آخر تک مسلمان نہیں ہوئے۔ اپنے باپ دادا کے مذہب پر رہے۔ اسی مذہب پر جان دی مگر بھتیجے کے اخلاق و کمالات اور ہمدردی خلق کا جو جذبہ بھتیجے کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس کے یہاں تک گرویدہ تھے کہ بھتیجے کی تعریف میں قصیدے کہاکرتے تھے ۔

ایک قصیدہ جس میں تقریباً سو شعر ہیں اس کوابن ہشام نے نقل کیا ہے۔ جس کا مشہور شعر یہ ہے، جس سے حضرت محمدؐ کے فیض بے پناہ کا اندازہ ہوتا ہے :

وابیض یستسقی الغمام بوجهہ ثمال[2] الیتامیٰ عصمة للارامل

وہ نورانی چہرہ والا جس کی ذات اور جس کے چہرہ کی برکت سے بادل بھی سیرابی حاصل

---

[1] الاستیعاب ذکرزید بن حارثہ
[2] الثمال کالغیاث الذی یقوم بامر قومہ

کرتا ہے ، یتیموں کا مربی بیواؤں کی عزت و آبرو کا محافظ ہے“

و ان فخرت یوماً فان محمداً   هوالمصطفیٰ من سرها و کریمها❷

”اور اگر کسی دن (کسی موقع پر) فخر کرنا چاہو تو محمد وہ منتخب شخصیت ہے جس سے کمالات قریش❸ کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں جو پورے قریش میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہیں۔“

نکاح

وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیۡنَ (نور ۔۱۴)

نکاح :

مکہ کی رہنے والی ایک ادھیڑ عمر کی خاتون (خدیجہ) جس کی عمر چالیس سال سے کم نہیں ہے، جو کئی بچوں کی ماں ہے، دو مرتبہ بیوہ ہوچکی ہے۔ تیسری مرتبہ شادی کے لئے ایک پچیس سالہ نوجوان سے سلسلہ جنبانی کرتی ہے ۔ یہ نوجوان حسب نسب کے لحاظ سے مکہ کے تمام شریف اور باعزت خاندانوں میں “نگ” ہے۔

---

❷ البدایہ والنہایہ ص ۲۵۸، ج ۲، و سیرة ابن ہشام ص ۷۰، ج۱

❸ چونکہ پہلے اشعار میں قریش کا ذکر ہے ، اس لئے یہاں یہ مفہوم لیا گیا۔ اس سیاق کا لحاظ نہ کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ محمد ، وہ شخصیت ہے جس سے کمالات انسانیت کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں ، جو پوری نوع انسان میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہیں۔

جسمانی صحت بہت عمدہ، شکل و صورت بے مثال، اخلاق و عادات میں پورے مکے کا قیمتی ہیرا۔ اس کے یہاں دولت کے انبار نہیں ہیں مگر کامیاب تجارت میں وہ نام پیدا کرچکا ہے کہ اس کے مقابلے میں دولت و ثروت ایک پرچھائیں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بیشک اس بیوہ کے لئے اس رشتے میں بہت سی دلچسپیاں ہوسکتی ہیں مگر اس پچیس سالہ نوجوان کے لئے دلچسپی کی ایک ایک چیز ختم ہے ۔ یہ خاتون دولت مند ضرور ہے ۔ لیکن جس خود دار نوجوان نے اپنی زندگی خود بنائی، جس نے بچپن میں بھی گوارا نہ کیاکہ اپنا بار دوسروں پر ڈالے، کسی خاتون کی دولت و ثروت اس کی خودداری اور غیرت کے لئے چیلنج تو ہوسکتی ہے ۔ دلچسپی اور کشش کا باعث نہیں بن سکتی۔ ہاں ، ایک بہت بڑی دولت اور ہے ۔ نیک نفسی، راست بازی، امانتداری، سچائی اور خلق خدا سے ہمدردی ۔ محمدﷺ کی ذات ستودہ صفات ان اوصاف کا خزانہ تھی۔ اور یہ نیک نفس خاتون جو دنیا کی تمام بہاروں سے آسودہ ہوچکی تھی ان اوصاف کی قدردان تھی، یعنی ایک طرف جوہر تھا تو دوسری طرف جوہری ۔

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

یہی سبب تھا کہ یہ رشتہ جو بظاہر ان مل بے جوڑ تھا ایسا مبارک ثابت ہوا کہ خاندان اور کنبے والے اس پر رشک کیا کرتے تھے ۔ خود آپ کی وہ بیویاں جو بعد میں آپ کی حرم بنیں ،

جب آنحضرت ﷺ کی زبانی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تعریفیں سنتی تھیں تو رشک کیا کرتی تھیں ۔

رشتہ کا سبب :

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جب دوسری مرتبہ بیوہ ہوچکیں تو اپنی تجارت کو باقی رکھنے کیلئے انہیں کسی ایسے امانتدار شخص کی ضرورت تھی جو کاروباری سلیقہ اور تجارتی تجربہ بھی رکھتا ہو ۔

آنحضرت ﷺ کی عمر اگرچہ تقریباً ۲۳سال تھی مگر آپ کے اوصاف حمیدہ کے چرچے شروع ہوگئے تھے ۔ کاروباری سلیقہ کی بھی شہرت ہوچکی تھی اور تجارتی قافلہ کے ساتھ شام جاکر بیرونی تجارت کا بھی آپ کو تجربہ ہوچکا تھا ۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی یہ شہرتیں سنیں پھر ذاتی طور پر بھی واقفیت حاصل کی، تو اپنے وسیع کاروبار کے لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ موزوں پایا چنانچہ آپ نے جوان صالح حضرت محمد بن عبداللہ القریشی المکی ﷺ کو پیشکش کی کہ وہ کاروبار کی ذمہ داری سنبھال لیں ۔ نفع میں ایک حصہ ان کا ہوگا ۔ آنحضرت ﷺ نے یہ پیشکش منظور فرمائی اور مال لے کر شام تشریف لے گئے۔ واپسی کے وقت آپ نے ایسا مال تلاش کیا، جس کا مکہ میں فوراً نکاس ہوجائے ۔ آپ نے شام سے یہ مال لاکر مکہ معظمہ میں فروخت کیا، تو نفع بدرجہازائد ہوا ۔ آنحضرت ﷺ

کی اس کاروباری دانشمندی، ہوشیاری اور مستعدی نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اس رائے کی تصدیق کردی جو وہ اس "ترقی پسند" نوجوان کے متعلق پہلے قائم کرچکی تھیں ۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شام جاتے وقت جب مال سپرد کیا تو خاص اپنے بھروسے کے غلام "میسرہ" کو بھی ساتھ کردیا تھا ۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ خدمت کرتے رہیں گے اورمقصد یہ تھا کہ مال کی نگرانی بھی رکھیں اور آنحضرت ﷺ کے طور و اطوار کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہیں ۔

سفر شام سے واپسی پر آنحضرت ﷺ نے منافع کا مال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا اور "میسرہ" نے نہ صرف امانتداری بلکہ آپ کے عام اخلاق کی بھی ایسی تعریف کی کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جو اپنی زندگی کا یہ آخری دور کسی راست باز کے حوالہ کرنا چاہتی تھیں "دامان محمد" ﷺ میں ان کو گوہرِمراد نظرآنے لگا ۔ انہوں نے آپ کے خاص احباب اور بزرگوں کے ذریعہ رشتے کی سلسلہ جنبانی کی۔ جس نے منظوری کا شرف عظیم حاصل کیا اورنکاح ہوگیا ۔ نکاح کے بعد تجارت اور کاروبار کی طرف خاص توجہ کا تذکرہ تو نہیں آتا، البتہ خدمت قوم، ہمدردی خلق، خدا پرستی اور خدا ترسی کے اوصاف روز افزوں نظرآتے ہیں ۔ ادھر خدیجہ رضی اللہ عنہا جن کے لئے یہی اوصاف باعث کشش تھے ان کی گرویدگی دن بدن بڑھ رہی ہے ۔ یہاں تک کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا محض خانگی زندگی ہی

میں رفیقہ حیات نہیں رہیں بلکہ قومی اور ملی خدمات میں بھی دہنا ہاتھ بنی رہیں ۔ آنحضرت ﷺ کی ذات پر تو ان کا ایک حبہ بھی کبھی صرف نہیں ہوا ۔ البتہ قومی اور ملی کاموں میں ان کی پوری دولت صرف ہوگئی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت وہ اس گھرانہ کی صاحب خانہ (گھرستن) تھیں جس کا فخر اور امتیازی نشان فقروفاقہ تھا ۔ خودآنحضرتﷺ فرمایا کرتے تھے لوگوں نے مجھے امداد سے محروم رکھا ۔ خدیجہ نے میری مدد کی ۔ لوگوں نے مجھے جھٹلایا، مگر خدیجہ نے ہر موقع پر میری تصدیق کی اور ہمت بڑھائی۔[1]

پچیس برس تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں ۔ چھ بچے ہوئے دو لڑکے جو بچپن ہی میں وفات پاگئے، چار لڑکیاں جو زندہ رہیں ۔ ان کے نکاح بیاہ بھی ہوئے مگر آنحضرتﷺ کی وفات سے پہلے یہ لڑکیاں بھی وفات پاچکی تھیں ۔ صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں جن کے دو لڑکوں (سیدنا حضرت حسن اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہما) کی اولاد کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کو سادات کہاجاتا ہے ۔

اخلاقی بدحالی، جذبہ اصلاح
امن پسندی اور صلح جوئی

[1] البدایہ والنہایہ ص ۱۲۹ ج ۲ والا ستیعاب وغیرہ

چھٹی صدی عیسوی جس کے آخری حصے میں یہ آفتاب طلوع ہوا ، ایک اندھیری رات تھی جس پر گمراہیوں اور ظلم و ستم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ۔

دولت پر غرور، جاگیروجائیداد پر گھمنڈ، نسلی اور خاندانی اونچ نیچ، اپنے آپ کو اونچا، دوسروں کو نیچا سمجھنا، یہاں تک کہ ان سے چھوت چھات کرنا، غریبوں کو دبانا، کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، عورتوں کو ایک خدمت گزار جاننا، شوہروں کے مرنے کے بعد ان کی زندگی کو اکارت ماننا، یہاں تک کہ ان کی خود کشی کو ان کے لئے ذریعہ نجات سمجھنا، خدا سے انکار کرنا، یا سینکڑوں ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا رگڑنا،من مانی باتوں کو مذہب اور دھرم سمجھ لینا، خود غرضی، بے رحمی ، سود، زنا، شراب ، رشوت، جوا وغیرہ ایسی بیماریاں تھیں جن کی وبا پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ عرب میں ان عام بیماریوں کے علاوہ :

(۱) ایک بیماری یہ تھی کہ پورے ملک کی کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا ۔

(۲) کچھ انسانوں کو ناپاک سمجھنے کا عقیدہ تو نہیں تھا مگر انسانی خون کو سستا اور مہنگا سمجھنا ان کا قومی مزاج بن چکا تھا، یعنی کسی معمولی قبیلہ کا کوئی آدمی اگر مارا جاتا خواہ وہ اس قبیلہ کا سردار ہی

ہوتا تو اس کے خون کے عوض میں چند اونٹ دینے کافی سمجھے جاتے تھے جس کو وہ دیت کہاکرتے تھے۔ لیکن اگر کسی بڑے قبیلے کا کوئی معمولی آدمی بھی مارا جاتا تو اس کے عوض میں قاتل کے ایک سے زائد اور انتہا یہ کہ کبھی پورے قبیلے کو تباہ کردینا بھی اپنا حق سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے ۔

(۳) فطرت جنگجو تھی، اس بنا پر معمولی بات پر بھی بڑی سے بڑی جنگ کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا جو سالہاسال جاری رہتا۔ مثلاً:

ایک شخص کا اونٹ کھیت میں چلاگیا ۔ کھیت والی عورت نے اسے مارا ۔ اونٹ والے نے عورت کی چھاتی کاٹ ڈالی۔ اس بات پر ۴۹۴ء سے ۵۳۵ء تک برابر لڑائی رہی ۔ یعنی اکتالیس سال برابر، کہتے ہیں ستر ہزار آدمی اس میں مارے گئے ۔

داحس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے بدکا دیا ۔ اتنی بات پر ایسا رن پڑا کہ قبیلے کے قبیلے کٹ مرے ۔ اس لڑائی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب اسلام کی امن پسندی نے محارب قبیلوں کے مزاج بدل دیئے ۔

مختصر یہ کہ ان قومی اور بین الاقوامی بیماریوں اور علتوں نے نہ صرف یہ کہ امن و امان کی زندگی کو ناممکن بنادیا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رحم، رواداری، بھائی چارگی، عدل و

انصاف، مروت و شرافت، مختصر یہ کہ انسانیت کی تمام شریف خصلتوں کے چراغ گل تھے ۔ قریش جیسے قبائل اگر چہ تمدن میں اپنا ممتاز مقام رکھتے تھے، مگر روح تمدن سے وہ بھی محروم تھے ۔ ان کی کاروباری منڈیاں بڑھ رہی تھیں مگر اخلاق کی جنس ان میں ناپید تھی ۔

حضرت محمدﷺ نے جیسے ہی بیدار مغز جوان صالح کی حیثیت سے شہری زندگی میں قدم جمایا، جس طرح آپ کو اپنے خالق اور پروردگار کی عبادت و پرستش کا شوق بڑھا، قوم کی یہ ابتر حالت بھی آپ کے دل کا درد اور جگر کا سوز بن گئی ۔ یہ سوزش آپ کو ہروقت بے چین اورمضطرب رکھتی ۔ مگر کوئی معمولی نسخہ شفاءاس درد کے لئے کارگرنہیں تھا ۔

اس درد کے علاج کیلئے ایک بہت بڑے سماجی انقلاب کی ضرورت تھی۔ لیکن وقتی طور پر ایک واقعہ نے موقع دیاکہ آپ اس میدان میں آگے بڑھیں ۔

واقعہ یہ تھا کہ یمن کا ایک سوداگر کچھ مال مکہ معظمہ میں لایا۔ مکہ کے ایک بیوپاری عاص[1] بن وائل سہمی نے اس کا مال خریدلیا اور جب قیمت ادا کرنے کاوقت آیا تو اس کو مارپیٹ کر بھگادیا ۔ وہ مکے والوں کے سامنے رویا دھویا مگر کسی نے پرواہ نہیں کی اور عاص بن وائل کا

---

[1] اپنے قبیلہ کا بار عب سردار بھی تھا ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حلیف تھا ۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے تو اس نے ان کو پناہ دی تھی ۔ حضرت عمروبن العاص انہیں کے فرزند تھے ۔

مقابلہ کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی ۔ مکہ جیسے تجارتی شہر کیلئے یہ بدنامی بہت خطرناک تھی۔ اس پر مکہ کے کچھ شرفاءنے ایک کنونشن کا انعقاد کیا ۔ محمد ﷺ اگرچہ ابھی بیس سالہ نوجوان تھے مگر امن وآشتی اور صلح ومصالحت جو آپکا فطری جذبہ تھا اس کا یہ اثر تھا کہ جیسے ہی آپ کو خبر ہوئی آپ بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ آپ کی شرکت کی یہ برکت تھی کہ واقعہ کا تعلق اگر چہ تجارت اور کاروباری سلسلہ سے تھا مگر غور و فکر کے دائرہ کو وسیع کیاگیا اور ایک ایسی سوسائٹی (انجمن) بنائی گئی جس کے ارکان کا یہ عہد ہوتا تھا: (۱) ہم اپنے وطن سے بے امنی دور کرینگے (۲) مسافروں کی حفاظت کیا کرینگے (۳) غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے۔(۴) طاقتور کو کمزور پر، بڑوں کو چھوٹوں پر ظلم کرنے اور ناانصافی سے روکا کریں گے ۔❷

مگر جب تک دلوں کی سطح ہموار نہ ہو اس طرح کے معاہدے پائیدار نہیں ہوتے کیونکہ ان کا منشا علاج نہیں ہوتا ، بلکہ دفع الوقتی ہوتا ہے ۔ وقت گزرتا جاتا ہے تو یہ معاہدے بھی فراموش ہوجاتے ہیں ۔ چنانچہ اسی طرح کا ایک معاہدہ پہلے بھی ہوچکا تھا جب مکہ پر قبیلہ جرہم کا قبضہ تھا ، مگر اب اس معاہدہ کا صرف نام یاد رہ گیا تھا ۔ یعنی "حلف الفضول"

بہرحال وقتی طور پر یہ امن اور حفاظت جان ومال کے لئے ایک اچھا اقدام تھا ۔ آنحضرت ﷺ

---

❷ ابن ہشام ص ۸۳ و ص ۸۴ ج ا

نے اسی ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اس میں حصہ لیا کہ نبوت کے بعد جب ایک مضبوط نظام مسلمانوں کا قائم ہوگیا تھا تب بھی آپ فرمایا کرتے تھے کہ قریش اگر حلف الفضول کو زندہ کریں تومیں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو اس میں حصہ لوں گا۔[۵]

خدا پرستی اور معرفت حق

خدا کو ایک ماننا اور اس کی عبادت کرنا، عقل سلیم کا تقاضا ہے ۔ مگر خدا پرستی کے وہ طریقے جن سے انسان روحانی ترقی اور ابدی سکون حاصل کرسکے، انسان اپنی عقل سے نہیں معلوم کرسکتا۔

عقل ان فیصلوں میں بھی بسا اوقات غلطی کرجاتی ہے جن کا تعلق مشاہدے سے ہے۔ انتہا یہ کہ وہ طاقتیں جو انسان کے اندر موجود ہیں اور تندرستی یا بیماری کی وہ کیفیتیں جو جسم انسان میں پائی جاتی ہیں ، چونکہ ان کا مشاہدہ نہیں ہوسکتا تو عقل ان کو پوری طرح پہچاننے سے بھی قاصر رہتی ہے اور پہچانتی ہے تو بسااوقات غلطی کرجاتی ہے ۔ انتہا یہ کہ ایکسرے جیسی نظرآنے والی چیز کے بعد بھی ڈاکٹروں کی تشخیص مختلف رہتی ہے، جن میں کوئی ایک صحیح ہوتی ہے اور کبھی ایک بھی صحیح نہیں ہوتی ۔ پس وہ معاملات جن کا تعلق ان حقیقتوں سے ہے جن تک مشاہدے کی رسائی

---

[۵] ابن ہشام ص ۸۴، ج۱

نہیں ہوسکتی، نہ ان کے تجربے کی کوئی صورت ممکن ہے۔ ان کے بارے میں عقل کے فیصلوں پر وہی شخص اعتماد کرسکتا ہے۔ جو انصاف جیسی نعمت سے محروم ہو، یا موجودہ زندگی کے فلسفے اور فکر مستقبل سے غافل اور لاپرواہ ہو ۔ مگر وہ صاحب فہم و فراست جو دیکھتاہے کہ ہر ایک فعل کی ایک تاثیر ہے۔ اور یہ بھی یقین رکھتا ہے۔ کہ معمولی کمی بیشی سے تاثیروں میں بے انتہا فرق آجاتا ہے ۔ اگر صحیح توازن قائم رہے۔ تو انسان ایٹم بم اور راکٹ تک بناسکتا ہے۔ اور چاند تاروں تک پہنچ سکتا ہے، لیکن توازن میں کچھ بھی فرق آجائے تو ساری محنت رائیگاں اور دولت برباد ہوجاتی ہے ۔ وہ ہرگز جرأت نہیں کرسکتا کہ مشاہدے سے بالا چیزوں کے بارے میں عقلی فیصلوں پر اعتماد کرلے ۔ وہ لامحالہ کسی ایسے مخبر اور ایسے رہنما کی تلاش کرے گا اور اس کی جستجو میں بے چین اور مضطرب رہے گا جو انسانی زندگی کے منتہا اور انجام کی صحیح خبر دے سکے ۔ اور وہ متوازن چیزیں بتاسکے جن سے روحانی صحت اور ترقی حاصل ہو اور ابدی سکون میسر آئے ۔

آنحضرت ﷺ کی فطرت سلیم نے آپ کو ایک خدا کی یاد پر آمادہ کیا۔ اس کا شوق پیدا ہوا۔ ایک طرف قومی زندگی میں آپ وہ اعتماد حاصل کرتے رہے کہ آپ کو“الصادق الامین” کا خطاب دیاگیا ۔ دوسری جانب یادخدا کا شوق اتنا ہی بڑھتا رہا۔ یاد خدا کے شوق کے ساتھ لامحالہ

نوع انسان کی اصلاح و ترقی کے سوالات بھی آپ کے سامنے آتے رہے ۔

* یہ اصلاح و ترقی صرف مادیات تک ہو یا اس کا تعلق روحانیت سے بھی ہو ؟
* انسانی زندگی صرف اسی ظاہری زندگی تک ہے یااس کے بعد بھی اس کا تعلق ہے ؟
* اگر انسان مرنے کے بعد بھی ایک وجود رکھتا ہے تو اس کی فلاح و بہبود کس طرح ہوسکتی ہے؟
* اصلاح کا وہ طریقہ کیا ہوکہ انسان اس زندگی میں بھی امن وسکون اور ترقی سے ہمکنار ہو اور اس کے بعد کی زندگی بھی ایک خوشگوار زندگی ہو اور اس طرح یہ اصلاح مکمل اصلاح ہو ۔

یہ وہ سوالات تھے جو آنحضرت ﷺ کے قلب حساس میں خلش پیدا کرنے لگے اور ان کی خلش یہاں تک بڑھی کہ آپ کو اس غور و فکر میں لطف آنے لگا۔ گویا یہی غوروخوص، فکر و مراقبہ آپ کی حیات مقدسہ کا جوہر بن گیا۔ اور چونکہ شہری زندگی اس میں خارج تھی تو آپ کو تنہائی پسند آنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ وابستگی یہاں تک بڑھی کہ آپ شہر سے باہر پہاڑ کی ایک کھومیں رہنے لگے ۔

حرا پہاڑ کا چار گز لمبا اور پونے دو گز چوڑا غار جہاں سے کعبہ مکرمہ بھی نظرآتا رہتا ہے اب بھی موجود ہے ۔ یہ مکہ شہر سے تقریباً تین میل ہے۔ راستہ اتنا دشوار کہ یہ تین میل تیس

میل سے بھی زیادہ کٹھن پڑتے ہیں ۔ طاقتور نوجوان بھی وہاں پہنچتے پہنچتے تھک جاتے ہیں ۔ مگر آنحضرت ﷺ نے یہ عادت بنالی تھی کہ پانی اورستو ساتھ لیتے اور اس غار میں پہنچ جاتے اور جب تک پھر ضرورت نہ ہوتی آپ وہیں یاد خدا، غوروفکر اورمراقبہ میں مشغول رہتے ۔

رفیقہ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی پوری وفاداری اور دل سوزی سے حق رفاقت ادا کرتی رہیں ۔ وہ پانی اور ستو کا ایک اندازہ رکھتیں اورجب ان کے اندازے سے آنحضرت ﷺ کی واپسی میں تاخیر ہوتی تو وہ خود پانی اور ستو لیکر اس غار پر پہنچ جاتیں ۔

آخرمیں چھ ماہ[1] ایسے گزرے کہ آپ کو عجیب و غریب خوابیں آتی تھیں اور وہ اپنی تعبیر میں ایسی ہی سچی ہوتی تھیں جیسے سپیدہ صبح طلوع آفتاب کی پیشن گوئی میں صادق ہوتا ہے۔ پھر آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ تو آفتاب آمد دلیل آفتاب، بقول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، آنحضرت ﷺ کا خواب بھی گویا سپیدہ صبح ہوتا تھا جس کے بعد آفتاب تعبیر کی درخشانی لازمی ہوتی تھی ۔[2]

---

[1] یعنی نبوت سے چھ ماہ پہلے

[2] بخاری شریف والبدایہ والنہایة وغیرہ

نبوت

آپ اسی غار میں تھے کہ ایک وجود نمودار ہوا۔ اس سے گھبراہٹ نہیں ہوئی بلکہ دل کو سکون ہوا۔ جیسے سوکھے ہونٹوں کو ٹھنڈا پانی مل گیا ۔

اس نے فرمائش کی : "اِقْرَاْ" پڑھو ۔

حضرت محمدﷺ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ نے عذر پیش کردیا، میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس وجود نے دوبارہ یہی کہا، اِقْرَاْ۔ پڑھو ۔ اس مرتبہ بھی حضرت محمدﷺ کا وہی عذر تھا ۔ اس وجود نے تیسری مرتبہ یہی کہا ۔ اس مرتبہ جواب میں حضرت محمدﷺ نے فرمایا : کیا پڑھوں ۔ اس وجود نے یہ آیتیں پڑھوائیں :

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۱ۚ خَلَقَ الْاِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۲ۚ
اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۳ۙ
الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۴ۙ عَلَّمَ الْاِنسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ۵ۙ

ترجمہ : پڑھ[1] اپنے رب کے نام سے جس نے (ساری

---

[1] یہ آیت ۶۲۲ ئ میں نازل ہوئی، یعنی ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں جو یورپ کے قرون وسطیٰ کا تاریک ترین زمانہ تھا جب مغربی یورپ پر جہالت کی گہری گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مشرقی یورپ میں کچھ تعلیم کا چرچا تھا تو اس کو کلیسا نے اپنی مخصوص

مخلوق کو) پیدا کیا ۔ بنایا انسان کو لہوکی پھٹکی (جمے ہوئے خون) سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے علم سکھایا قلم سے ۔ سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا “

آپ نے یہ آیتیں پڑھیں ۔ آیتیں ذہن نشین ہوگئیں ۔ مگر ساتھ ساتھ ذمہ داری کا احساس بھی ہوا۔ ایک طرف اپنی عاجزی کا غیرمعمولی احساس تھا۔ آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ ہیچ درہیچ سمجھتے تھے ۔ دوسری طرف اتنی بڑی ذمہ داری، اور ایسی ذمہ داری جس کا کوئی تجربہ اب تک نہیں تھا ۔ یعنی بھٹکی ہوئی مخلوق کو پڑھنے پڑھانے، تعلیم دینے اور سدھارنے کی ذمہ داری، اور ایسی صورت سے جو بالکل اجنبی صورت تھی۔ جس کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں آیا تھا نہ کسی سے ایسی باتیں سنی تھیں ۔ اس طرح کے خیالات اور غیرمعمولی احساس کا اثر یہ ہوا کہ دل کانپنے لگا ۔ آپ مکان پر پہنچے تو لرزے جیسی کیفیت تھی۔ آپ نے رفیقہ حیات (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) سے کہا :

“میرے اوپر کپڑا ڈال دو” ۔[1]

جائداد سمجھ رکھا تھا۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ دست درازی کرسکے۔ ہندوستان میں جو کچھ علم تھا وہ چند گھرانوں کی ملکیت تھا۔ کسی غیر تک اگر بھنک پہونچ جاتی تو اس کے کان میں سیسہ پلادیا جاتا تھا۔

[1] خود قرآن پاک کی عظمت اور اس کا وقار ایک با احساس کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کافی ہے ۔ ارشاد ربانی ہے ۔ لوانزلنا هذا القران علیٰ جبلٍ لرایتہ الخ اگر

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کیا بات ہے ؟ طبعیت کو سکون ہوا تو آپ نے پورا قصہ سنایا اور یہ بھی فرمایا ، مجھے خوف ہے کہ ایسی بڑی ذمہ داری کس طرح اٹھاسکوں گا ۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سمجھدار خاتون تھیں ، حضرت محمد کو جس طرح پندرہ سال سے دیکھ رہی تھیں ، ان کو یقین تھا کہ اس غیرمعمولی شخص کے لئے کوئی غیرمعمولی صورت نمودار ہوگی جس کی شان نرالی ہوگی ۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پورا واقعہ سنا ، پھر وہ آیتیں سنیں جن میں اس طرف اشارہ تھا کہ خدا قادر جو خون کے لوتھڑے سے جیتا جاگتا انسان بناتا ہے ، قلم کے ذریعہ لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے، انسان کو وہ باتیں بتاتا ہے جن کو وہ اپنے ذہن سے نہیں معلوم کرسکتا تھا ، وہ خدا قادر کسی استاد یا قلم کی مدد بغیر محض اپنی قدرت سے علم کے دروازے آپ پر کھول دیگا۔

یہ آیتیں سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یقین ہوگیا کہ جس غیرمعمولی صورت کی توقع تھی وہ سامنے آگئی ہے ۔

وہ اس واقعہ کے متعلق کوئی فیصلہ تو نہیں کرسکیں ، البتہ حضرت محمد نے جو اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے

ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اورپھٹ جاتا (سورہ حشر آخری رکوع پ ۲۸)

میری جان جاتی رہے گی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا ۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی زندگی کا مرقع پیش کرکے بہت لطیف پیرایہ میں اطمینان دلایا کہ آپ یہ باراٹھاسکیں گے کیونکہ اب تک کی زندگی میں جو بوجھ اٹھاتے رہے ہیں وہ کم نہیں وہ بھی غیرمعمولی ہیں ۔ پس اگر کوئی اس سے بھی بڑی ذمہ داری آپ پر پڑے گی آپ اس کو بھی اٹھاسکیں گے ۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا : کلا واللّٰہ لایخزیک اللّٰہ ابداً انک لتصلُ الرحم و تحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف و تعین علی نوائب الحق (بخاری شریف ص ۷۴۰) ترجمہ : خدا شاہد ہے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتاہے کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام کردے ، آپ کی مدد نہ کرے آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں ، ان کی مدد کرتے ہیں ، ان کو منزل تک پہنچاتے ہیں ، آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی، جو دوسری جگہ قطعاً نایاب ہیں ، باہر کے مسافر جو بے ٹھکانا ہوتے ہیں آپ ان کو اپنا مہمان بناتے ہیں ، برپا ہونے والے ہنگاموں اور ناگہانی حواد ث میں آپ حق کی حمایت کرتے ہیں ۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس طرح تسلی دی، لیکن یہ ان کی رائے اور ان کا اپنا اعتقاد تھا کہ جو اس طرح صاحب خیر ہو، خدا کی طرف سے اس کی مدد ہوگی ، اس کو ذلیل و رسوا

اور ناکام نہیں کیا جائے گا ۔ لیکن اس طرح کے معاملے کی حقیقت وہ بھی نہیں جانتی تھیں ، کیونکہ نبوت اور الہام کی باتوں سے وہ بھی واقف نہیں تھیں ۔ ان کو ایک شخص کا خیال آیا ، یہ حضرت خدیجہ ضللہعنہا کے ہم جد تھے ، رشتہ کے بھائی ہوتے تھے، عیسائی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے۔ عالم فاضل تھے۔ نبوت اور الہام کی باتیں جانتے تھے۔ عبرانی زبان پر ان کو عبور تھا۔ عبرانی کی اصل انجیل کا مطالعہ کیاکرتے تھے۔ عربی میں اس کا ترجمہ بھی کیاکرتے تھے۔ اب بہت بوڑھے تھے۔ بصارت سے بھی معذور ہوچکے تھے ۔ مگر لوگ ان کی قدر کرتے تھے ۔ ان کا نام ورقہ تھا ولدیت نوفل ۔

حضرت خدیجہ ضللہعنہا حضرت محمدﷺ کو ساتھ لے کر ان کے یہاں پہنچی اور کہا : آپ کے برادرزادہ حضرت محمدﷺ کو عجیب صورت پیش آئی ہے۔ یہ خود ہی بیان کرینگے ۔ آپ غور سے سنئے اور رائے دیجئے ۔

حضرت محمد ﷺ نے پورا واقعہ بیان کیا ۔

ورقہ نے جیسے ہی سنا برجستہ جواب دیا :

یہ تو وہی ناموس[1] (فرشتہ) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیسلم پر نازل فرمایا تھا ۔

ورقہ نے کہا : میں بوڑھا ہوگیا ہوں ۔ کاش میں جوان ہوتا! کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی!

---

[1] راز دار فرشتہ فتح الباری

حضرت محمد ﷺ نے سنا کہ قوم ان کو نکالے گی تو بہت تعجب ہوا ۔ یہ قوم جو یہاں تک گرویدہ ہے کہ عقیدت اور احترام میں نام لینا بے ادبی سمجھتی ہے، مجھ سے دعائیں کراتی ہے اور بڑے معاملات کا فیصلہ کرنا میرے حوالے کردیتی ہے، کیا وہ ایسی آنکھیں پھیرلے گی کہ مجھے مکہ سے نکال دیگی؟

حضرت محمد ﷺ جیسے محبوب رہنما کے لئے یہ بہت ہی عجیب بات تھی ۔ آپ نے تعجب سے دریافت کیا : "کیا میری قوم مجھے نکالے گی ؟"

ورقہ ! بیشک آپ کو نکالے گی اور یہ انوکھی بات نہیں ہے۔ جو شخص بھی ایسی بات پیش کرتا ہے جو آپ پیش کرنے والے ہیں اس کے ساتھ قوم کا برتاؤ یہی ہوا کرتا ہے ۔ کاش میرے سامنے وہ دن آئے تو میں آپ کی پوری پوری مدد کروں !

ورقہ تو زندہ نہیں رہے ۔ کچھ دنوں بعد ان کی وفات ہوگئی مگر جوبات انہوں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی ۔

یہ تھا نبوت کا آغاز اور یہ تھی وحی کی ابتداءجس میں پڑھنے پڑھانے، علم اور قلم کا تذکرہ اور عالمانہ زندگی کی ترغیب ہے ۔ (واللہ اعلم) ابتدائی ظہور کے بعد یہ سلسلہ کچھ عرصہ کیلئے بند ہوگیا ۔

تبلیغ اور دعوت عام سے پہلے تربیت

حضرت محمد ﷺ کی چالیس سالہ مثالی زندگی

نہ آپ کو الصادق اور الامین اور ایسا محبوب رہنما بنادیا تھا جس کے اعلیٰ اخلاق اور بہترین کردار پر مکے کے ہر ایک چھوٹے بڑے کو پورا اعتماد تھا۔ مگر ان اعلیٰ اخلاق کے باوجود منصب نبوت کے فرائض اور اداءفرائض کے طریقوں سے آپ قطعاً ناواقف تھے ۔ قرآن مجید نے آپ کی شان یہ بیان کی ہے ۔

(الف) نہ آپ لکھ سکتے تھے، نہ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے ، نہ آپ نے کہیں تعلیم پائی تھی۔[1] نہ آپ شاعر تھے، نہ ادیب کی حیثیت سے آپ کی شہرت تھی۔[2] نہ آپ کاہن یا نجوم داں تھے۔[3] نہ سابق مذہبوں سے آپ کو واقفیت تھی۔[4] نہ آپ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے، آسمانی کتاب کیا ہوتی ہے[5] نہ آپ کو کبھی یہ خیال آیا تھا کہ آپ پر کوئی کتاب نازل ہوگی۔[6] نہ اس شہر میں جہاں آپ پلے تھے،بڑھے تھے ، نبوت یا رسالت کا چرچا تھا انتہا یہ کہ وہ قوم جس کے آپ فرد تھے اُمی تھی یعنی نبوت سے ناآشنا کیونکہ اس میں کوئی نبی نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم ں کا نام سنا تھا۔ مگر ان کی تعلیمات فراموش ہوچکی تھیں صرف دھندلے سے نشان باقی تھے۔ لیکن اب آپ پر یہ ذمہ دری ڈالی گئی تھی کہ ایسی قوم

---

[1] سورہ عنکبوت ۲۹ آیت ۴۸
[2] سورہ یٰسین ۳۶ آیت ۶۹
[3] سورہ الحاقہ ۶۹ آیت ۴۱ و ۴۲
[4] سورہ قصص ۲۸ آیت ۴۴ تا ۴۶
[5] سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۵۲
[6] سورہ قصص ۳۸ آیت ۸۶

میں مکمل انقلاب برپا کریں ۔ جو اگرچہ گمراہ ہیں مگر اپنے آپ کو تمام دنیا کی قوموں میں سب سے بہتر اور برتر سمجھتی ہیں اور یقین رکھتی ہیں کہ حق وہی ہے جس[7] پر وہ قائم ہیں ۔ اور اس انقلاب کا آغاز خاص اس گروہ سے کریں جس کو نہ صرف اس کا یقین ہے کہ وہ حق پر ہیں بلکہ یہ فخر بھی ہے ۔ کہ وہ اپنے مذہب میں نہایت پختہ اور کٹر ہیں ۔ [8]

اس قوم (عرب) سے متصل ایک طرف ایران، عراق، فارس اور ان سے متصل ہندوستان ہے ۔ ان کے مذہب اگرچہ مختلف ہیں مگر پرستش غیراللہ (شرک) میں سب شریک ہیں ۔ کوئی بت پرست ہے کوئی کواکب پرست، کوئی عجائب پرست ، ہر ایک کے پاس ایک فلسفہ ہے اور ہر ایک کو اپنی روایات، اپنے تمدن، اپنی عقل و دانش اور اپنے فلسفہ پر ناز ہے ۔

دوسری طرف شام، مصر ، افریقہ اور یورپ کے علاقوں میں باز نطینی شہنشاہیت کے پرچم لہرارہے ہیں ۔ اور اگر چہ آج بیسویں صدی عیسوی میں چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے دور کو قرون وسطیٰ کا پس ماندہ غیرمہذب اور غیرترقی یافتہ تاریک ترین دور کہاجاتا ہے۔ مگر یہی علاقہ ہیں جہاں رومتہ الکبریٰ کا مشہور قانون (رومن لا) جاری ہے او اسی علاقہ میں

---

[7] سورہ الانفال آیت ۳۲ وَ اِذْ قَالُوا اللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَالْحَقَّ الخ

[8] اپنے آپ کو وہ احمس یا حمس کہتے تھے یعنی اپنے مذہب میں کٹر اور نہایت پختہ

سقراط، بقراط، ارسطو، افلاطون، فیثاغورث جیسے باکمال فلاسفہ اور موجد گزرچکے ہیں ۔ جن کے فلسفہ کو آج بیسویں صدی میں بھی زندہ فلسفہ کہاجاتا ہے ۔

پس ماندہ لیکن کٹر عرب[2] کا ایک اُمی ان تمام علاقوں اور ان میں بسنے والے انسانوں یعنی پورے نوع بشر کے لئے ہادی اور رہنما بنایا جارہا ہے۔ منصب رسالت اس کے سپرد ہونے والا ہے تو اس سے پہلے کہ وہ دوسروں کو دعوت دے ضروری ہے کہ جن باتوں کی وہ دعوت دے ان کا نمونہ وہ خود[3] بن جائے ۔ چنانچہ نبوت کے بعد کم وبیش تین سال ایسے گزرے جن میں حضرت محمد ﷺ کو عام دعوت و تبلیغ کا حکم نہیں تھا ہاں ، کچھ سعادت مند وہ تھے جنہوں نے مشک کی خوشبو خود سونگھ لی اور وہ خود ہی اس شمع کے پروانے بن گئے ۔ ان میں سب سے پہلے یہ حضرات ہیں ابوبکر، خدیجہ، علی، زید بن حارثہ اور اُم ایمن (رضی اللہ علیہم اجمعین) یہ تعداد میں صرف پانچ ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کا تعلق آزاد، غلام، مرد، عورت، بچہ یعنی نوع

---

[2] قبیلہ قریش اور ثقیف وغیرہ چند قبائل اگرچہ متمدن تھے مگر عرب قوم متمدن نہیں تھی ۔ اس کی بڑی تعداد بادیہ نشین صحرا نور دتھی ۔ محمد میاں

[3] تاکہ مقصد رسالت پورا ہو۔ کیونکہ نبوت اور رسالت اس لئے نہیں کہ پیغام پہنچادیا جائے بلکہ بشرکو نبی یا رسول بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ نوع بشر کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کیاجائے ۔ (دیکھو سورہ ۶ الانعام آیت ۷ تا ۱۰)

انسان کے ہر طبقے سے تھے ۔

آزاد مردوں میں ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ)

آزاد عورتوں میں خدیجہ (رضی اللہ عنہا)

بچوں میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ)

آزاد کردہ غلاموں میں زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) جو اس وقت زید بن محمد کہلاتے تھے

آزاد کردہ باندیوں میں اُم ایمن (رضی اللہ عنہا) جو بچپن سے آنحضرت ﷺ کی ماما (خادمہ)تھیں ۔

ان حضرات نے بھی ابھی تبلیغ شروع نہیں کی ۔ لیکن کچھ اور افراد جن کے کردار نے مستقبل میں ثابت کردیا کہ وہ بہترین انسان اور پورے سماج کے قیمتی جواہرتھے، وہ خود متاثر ہوئے اور دعوت عام سے پہلے آغوش اسلام میں داخل ہوگئے ۔ ان کے اسماءگرامی یہ ہیں (ان کے پرتقدس کارنامے تاریخ عالم کے سینے پر نقش ہیں جو شہادت دے رہے ہیں کہ یہ حضرات کس درجہ صداقت پسند، حق گو، دلیراور بہادر تھے اور اسی لئے وہ سب سے پہلے الصادق الامین اور اس کے پیغام کے گرویدہ ہوگئے تھے)

عثمان بن عفان، طلحہ بن عبیداللہ، زبیربن عوام، سعد بن ابی وقاص، عثمان بن مظعون، ابوعبیدہ بن الجراح، عبدالرحمن بن عوف، ابوسلمہ بن عبدالاسد، ارقم بن ابی ارقم[۵] (رضی اللہ علیہم اجمعین)نے تعلیم وتربیت کے اس بنیادی دور میں ان کی تربیت بھی ہوتی رہی ۔

---

۵ البدایہ والنہایہ ص ۳۷ ج۳

نصاب و طریقہ تربیت

قرآن پاک کی وہ سورتیں جو ابتداء میں نازل ہوئیں انہیں کو نصاب کہاجاسکتا ہے۔ ان سورتوں میں عقائد و نظریات کی بھی تعلیم دی گئی اور طریقہ تربیت بھی بتایا گیا ہے ۔ عجیب بات جو ایک طالب حق کو مطمئن اور گرویدہ بنادیتی ہے یہ ہے کہ جن عقائد و نظریات کی تعلیم ابتداءمیں دی گئی، باقی ۲۳ سالہ زندگی میں ان کی ہی تشریح اور توضیح ہوتی رہی، ترمیم کسی ایک میں بھی نہیں ہوئی ۔ بنیادی تعلیمات درج ذیل ہیں ۔ آیتوں اور سورتوں کے نمبر حاشیے میں لکھ دیئے گئے ہیں ۔

- ⋆ پوری کائنات کا ایک خالق ہے جسکی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ رب العالمین اور ارحم الراحمین ہے (یعنی مخلوقات کے جس قدر طبقات اور درجات کائنات عالم میں ہیں وہ ان کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ اس نے ہر مخلوق کی ایک فطرت بنائی اور اس فطرت کے بموجب نشوونما، بقا و تحفظ، تدریجی ترقی اوردرجہ کمال تک پہنچنے کیلئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اس کی رحمت نے ان کو مہیاکیا اور برابر مہیا کرتی رہتی ہے)۔ تمام جہانوں کا رب اور سب پر رحم کرنے والا وہی ہے۔ تمام کمالات اسی کو حاصل ہیں ۔ تمام تعریفوں کا وہی مستحق ہے ۔❷
- ⋆ مشرق و مغرب کا رب وہی ہے ۔ وہی معبود ہے

---

❷ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سورہ ۱ آیت ۱و ۲

اس کے سواءاور کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے ۔[3]

- اس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، اس کو دولت علم سے نوازا اور ترقی کے راستے پر لگایا ۔[1]
- وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ قلم اور لکھنے پڑھنے کے ذریعے تعلیم کا طریقہ اسی نے بتایا [2]وہ اس ذریعے کے بغیر بھی جس کو چاہے عالم وفاضل اور سرتاج فضلاءبناسکتا ہے ۔
- وہ ایک ہے، یکتا ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں سب اس کے محتاج ہیں ، نہ اس کے اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کا کوئی ہمسرنہیں ہے ۔[3]
- انسان کا ہر ایک عمل اچھا ہو یا برا ایک حقیقت ہے۔ ہر ایک عمل اپنا اثر رکھتا ہے ۔ انسان اپنے اعمال کے جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے جیسے کوئی قیدی۔[4]
- کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا کسی پر دوسرے کا گناہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ ہر شخص اپنا اور اپنے فعل کا ذمہ دار ہے ۔ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا ۔ انسان جو کچھ کماتا ہے وہ اس کے سامنے آئے گا۔[5]

---

[3] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۹ ،
[1] سورہ علق ۹۶ آیت ۲ و ۴
[2] سورہ علق ۹۶ آیت ۳
[3] سورہ اخلاص۲ ۱۱
[4] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۸
[5] سورہ والنجم ۵۳ آیت ۳۸ ، ۳۹ ، ۴۰ ،

- ایک خاص دن ہوگا جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب اور ہر معاملے کا انصاف ہوگا۔[6]
- خدا کی مخلوق صرف وہی نہیں ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مخلوق ہے ۔ ایک خاص مخلوق وہ ہے جس کو فرشتے کہاجاتا ہے۔ ان کی تعداد کا علم صرف ان کے خالق اللہ رب العالمین ہی کو ہے ۔[7] وہ خدا کے حکم کے سوا کچھ نہیں کرسکتے۔[8] ان کی زندگی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل اور خدا کی حمد و ثناءکرتے رہتے ہیں ۔ وہ خدا کے حکم سے انسانوں پر خدا کی نعمتیں بھی نازل کرتے ہیں اور خدا کے حکم سے خدا کا قہر بھی بندوں پر اتارتے ہیں ۔ [9]
- اللہ تعالیٰ انسانوں کی صحیح رہنمائی کے لئے نبی اور رسول بھیجتا ہے ۔[10] نبی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، صرف وہ کہتا ہے جو خدا اس کو بتاتا ہے۔[11]
- علم اور یقینی بات وہی ہے جو اللہ کے بتانے سے رسول بتاتا ہے ۔ اسکے علاوہ جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ ظن ہے (تخمینی اور

---

[6] سورة الفاتحہ ۱ آیت ۳
[7] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۱
[8] سورہ والنجم ۵۳ آیت ۲۵
[9] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۱
[10] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۵
[11] والنجم ۵۳ آیت ۳۔۴

اٹکل کی باتیں ہیں)، جو علم و یقین کا مقابلہ نہیں کرسکتیں ۔❷

- ⋆ تزکیہ نفس اور دل کو پاک کرنے اور روحانیت کو ترقی دینے کی صورتیں یہ ہیں ۔
اللہ کو یاد کرو ۔ دن کو یاد کرو ۔ رات کو جاگ کر خدا کو یاد کرو۔❸ نمازیں پڑھو ۔ زکوٰۃ ادا کرو (جو ایک لازمی فریضہ ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ) اللہ کو قرض دو (ملی اور قومی کاموں میں خرچ کرو وہ اللہ تعالیٰ پر قرض ہوگا) کوئی نیک عمل ضائع نہیں کیا جائے گا۔ جو نیکی کروگے خدا کے یہاں اس سے بہتر اور بڑھا ہوا پاؤ گے ۔ جو غلطیاں اورکوتاہیاں ہوتی رہیں اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی اورمغفرت چاہتے رہو ۔❹
- ⋆ دولت کو اللہ کا انعام سمجھو ۔ ہر ایک غرض سے بلند ہوکر صرف اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل اور اس کی رضا حاصل کرنے کیلئے ہر ایک ضرورت مند کی مدد کرو اور اس سے کہہ دو کہ ہم کوئی بدلہ نہیں چاہتے صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں ۔❺
- ⋆ روحانیت کی پاکی کے لئے یہ بھی ضرری ہے کہ جسم کو پاک رکھو ۔ لباس پاک رکھو ہر ایک پلیدی کو (ظاہری ہو یا باطنی) دور کرو ۔❻

---

❷ والنجم ۵۳ آیت ۲۸
❸ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۲، ۳، ۴
❹ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۲۰
❺ سورہ دہر ۷۶ آیت ۸، ۹ و سورہ مدثر ۷۴ آیت ۶
❻ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۴ و ۵

★ عذاب کے کام (جن سے انسان کی ابدی زندگی برباد ہوتی ہے اور دوزخ کا مستحق ہوجاتا ہے) یہ ہیں : نماز نہ پڑھنا، غریبوں کی امداد نہ کرنا، بیکار باتوں (اور خدا سے غافل کرنے والے کاموں) میں منہمک رہنا ، عذاب و ثواب یعنی پاداش عمل پر یقین نہ رکھنا[6] کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرکے اس پر احسان جتانا ہے[7]
ایسی صورتیں اختیار کرنا کہ دولت اپنے پاس جمع رہے اور غریبوں اور ضرورتمندوں کی امداد نہ ہو[8]

★ اچھے آدمی جن کے نقش قدم پر چلنا چاہئے وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام سے نوازا[1]
یعنی[2] (الف) خدا کے برگزیدہ نبی : جو ایسے پاک فطرت ہوتے ہیں کہ ہمیشہ گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں ۔
(ب) صدیق :جو اپنے قول و فعل میں نہایت سچے، جن کا ضمیر سچا، جن کے ہر فعل میں سچائی اور صداقت، یہاں تک کہ وہ سچائی کا پیکر اور صداقت کی تصویر ہوتے ہیں ۔
(ج) شہید : جو حق و صداقت کے راستے

---

[6] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۴۳ تا ۴۶
[7] ایضاً آیت ۶
[8] سورہ القلم ۶۸ آیت ۱۶ تا ۳۰
[1] سورہ فاتحہ ۱ آیت ۵
[2] یہ تشریح قرآن پاک میں بعد میں نازل ہوئی (سورہ نساء۴ آیت ۶۹) لیکن عمل پہلے دن سے اسی پر تھا ۔

میں ہر ایک قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں
جن کا جذبہ یہی ہوتا ہے کہ راہ حق میں
قربان ہوں ۔ اس کے علاوہ اور اپنے تمام
جذبات قربان کردیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے
آپ کو بھی قربان کردیتے ہیں ۔

(د) صالح :نیک کردار، پاکباز، پاک طینت،
جو اچھے کاموں کی بہترین صلاحیت
رکھتے ہیں اور اس صلاحیت کو عمل میں
لاتے رہتے ہیں ۔

★ مومن صالح اور سچا مسلمان وہ ہے جو راتوں
کو جاگ کر خدا کو یاد کرے۔ دن کے
کاموں کو خوبی سے انجام دے اور دل میں یاد
خدا رکھے ۔ اسی سے اس کا دل لگارہے ۔ اسی
پر بھروسہ رکھے، نمازیں پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے،
قومی اور ملی کاموں کے لئے دولت خرچ کرتا
رہے۔ اپنی غلطیوں اورکوتاہیوں کی معافی
مانگتا رہے ۔ مخالفین کی باتوں کو ضبط و
تحمل سے برداشت کرے ۔ برداشت سے باہر
ہوجائیں تو خوش اسلوبی، سنجیدگی اور
نرمی کے ساتھ ان سے الگ ہوجائے[3]۔ جو قول
و قرار کے پکے ہوں ، جو منت مان لیں یا عہد
کرلیں اس کو پورا کریں ۔ جو بلا لحاظ مذہب
و فرقہ مسکینوں ، یتیموں اور قیدیوں کی
امداد کو اپنا فرض سمجھیں ۔ اپنی ضرورتیں
پیچھے ڈالیں ان کی ضرورتیں پوری کریں ۔
خدا کی خوشنودی ان کا نصب العین ہو۔ جو

---

[3] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۔۷، ۸، ۹، ۱۰ و ۲۰

کچھ کریں خدا کے لئے ہی کریں ۔ کسی انسان سے کوئی معاوضہ گوارا نہ کریں ۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہ چاہیں کہ کوئی انسان ان کا کسی طرح شکریہ ادا کرے ۔ خوف خدا، خدا کی عظمت اور اپنے انجام کی فکر ان کے دل و دماغ پر چھائی رہے۔ جو کچھ کریں اسی لئے کریں ۔[4]

* بدترین انسان وہ ہیں جو حکومت اور اپنے اقتدار پر گھمنڈ کریں ۔ جن کو اپنی شاہنشاہیت پر ناز ہو (جیسے فرعون)۔ جو اپنی دولت کے نشے میں صداقت سے منہ موڑیں ۔ حقائق کو جھٹلائیں ۔[5]

جن کو اپنی دولت پر، اپنی اولاد پر، اپنے مادی ذرائع و وسائل پر ناز ہو انہیں کی بڑھوتی کی اڈھیڑ بن میں رات دن لگے رہیں ۔ ذخیرہ اندوزی کے حریص ہوں ، حق کے مقابلہ میں اکڑجائیں ، سچائی کی توہین کریں ، عبرت کی آنکھیں بند رکھیں ۔[6]خدا کی مخلوق کو بھول جائیں ۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسمیں کھانے سے نہ شرمائیں ۔ بلکہ اس کو ہوشیاری اور فن کاری سمجھیں ۔ کسی کو چڑھائیں کسی کا اتاریں ۔ لگی بجھی کرتے رہیں ۔ چغلیاں کریں ۔ نہ ان کی نظرمیں شرافت اور اخلاق کی قدر ہو نہ عصمت اور پاک دامنی کی۔ جن کی کوشش یہ

---

[4] سورہ دہر آیت ۷، ۸، ۹و ۱۰
[5] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۵، ۱۶ وآیت ۱۱
[6] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۱۱ تا ۱۶

ہوکے غریبوں کا حق دبائیں اور اپنا سرمایہ بڑھائیں ۔[2]

طریقۂ تربیت

* رات کو اٹھو، جاگو، آدھی رات یا آدھی رات کے قریب یاد خدا میں کھڑے ہوکر گزارو۔[3]
* قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھو۔[4] (تبلیغ خصوصاً فرائض نبوت کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ ریاضت و مجاہدہ یعنی محنت کرنے اور مشکلات کو برداشت کرنے کی عادت ہو،ضمیر پاک ہو، اس کی تمام صلاحیتیں بیدار ہوں ، جو بات نکلے دل سے نکلے، ہر ایک بات نہایت ٹھیک اور سنجیدہ ہو ، شب بیداری سے یہ خصلتیں پیدا ہوتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں کیونکہ) یہ حقیقت ہے کہ رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے۔[5] (لہذا شب بیداری کرو تاکہ یہ خصلتیں پیدا ہوں کیونکہ) ہم عنقریب ڈالیں گے تم پر بھاری کلام۔[6]
* پورے دن کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھو۔[7]
* اپنے رب کے نام کا ذکر جاری رکھو۔[8]

---

[2] سورہ قلم ۶۸ آیت ۸ ۔ ۱۰ تا ۲۴
[3] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۲،۳
[4] ایضاً آیت ۴
[5] ایضاً آیت ۶
[6] ایضاً آیت ۵
[7] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۷
[8] ایضاً آیت ۸

- اور سب سے کٹ کر اسی کے ہوجاؤ۔[9]
- خدا کو اپنا وکیل اور ذمہ دار بنالو[10] اسی پر بھروسہ رکھو ۔
- اس عقیدے کو اپنے اوپر حاوی کرلو کہ مشرق و مغرب (اور تمام عالم) کا رب وہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں جو معبود اور الٰہ ہو ۔[1]
- جو کچھ وہ (مخالفین)کہتے ہیں اس پر ضبط و تحمل سے کام لو[2] ، زیادہ سے زیادہ برداشت کی عادت ڈالو۔
- دنیا داروں سے کنارہ کرو (مگر خوبصورتی کے ساتھ [3]، یہ کنارہ کشی ایسی ہو کہ اپنے اندر جمال رکھتی ہو ، نفرت نہ ہو بلکہ ایسی ہوجیسے طبیب، بیمار کی بیماری سے اپنا بچاؤ کرتا ہے ، مگر اس طرح کہ اس بچاؤ میں بھی دلداری ہوتی ہے۔ مرض کا علاج کرتا ہے، مریض کا دل نہیں توڑتا)۔

داعی الی اللہ کے اوصاف اور ان کی تربیت و تکمیل

جس ذات کو اس لئے اٹھایا جارہا ہو کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے، بھٹکی ہوئی مخلوق کو حق و صداقت کے صراط مستقیم

---

[9] ایضاً آیت ۸
[10] ایضاً آیت ۹
[1] ایضاً آیت ۱۰
[2] ایضاً آیت ۱۰
[3] ایضاً آیت ۱۰

اورنیکی اور سچائی کے شاہراہ اعظم پر چلائے ۔ اس کے کچھ اوصاف ہونے چاہئیں ۔ قرآن حکیم میں جابجا ان اوصاف کی طرف اشارے اور کہیں تصریح پائی جاتی ہے ۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ایک بہترین مثال ہے اور ان اشاروں اور تصریحات کی شہادت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کی ذات اقدس بہترین مثال اور نمونہ اس لئے تھی کہ مقاصد دعوت و ہدایت کے لئے آپ کی تربیت خاص طور پر کی گئی تھی ۔ داعی حق کے تمام اوصاف اس مختصر کتابچہ میں بیان نہیں کئے جاسکتے یہاں صرف چند اوصاف بیان کئے جارہے ہیں ۔

(۱) ہمدردی: کامیاب داعی اور ہادی کو شمع اور چراغ ہونا چاہئے ۔ شمع پوری محفل کو فیض پہنچاتی ہے۔ تاریک مجلس کو روشنی سے بھردیتی ہے۔ مگر اس طرح کہ اہل محفل کے لئے خود فناہوتی رہتی ہے ۔ ایک سوز ہوتا ہے جو اس کے تن من کو تحلیل کرتا رہتا ہے ۔ داعی حق بھی اسی طرح سوزوگداز کا پیکر ہوتا ہے ۔ وہ اپنی بقاءاسی میں سمجھتا ہے کہ راہ حق میں خود کو فنا کردے ۔ قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ محمد ﷺ سراج منیر (شمع سوزاں) تھے[4] اور درد دل کا عالم یہ تھا کہ جان عزیز اسی میں

---

[4] یٰٓاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۔۴۵ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۔۴۶ (احزاب ۴۵،۴۶)

گهلارہے تهے[5] کہ بهٹکے ہوئے انسان سیدهے راستے پر آجائیں ۔

(۲) اذعان اوریقین: (الف) ایک شخص اونچے پہاڑ پرکهڑا ہوا، دشمن کے لشکر کودیکھ رہا ہے جو تیزی سے حملہ کرنے کےلئے آرہا ہے ۔ اس کی بستی کے آدمی، پہاڑ کے پیچهے ہیں وہ نہیں دیکھ رہے۔ یہ دیکهنے والا شخص جس خطرے سے اپنی قوم کو آگاہ کررہاہے، وہ اس کا مشاہدہ کررہا ہے۔ اس لئے وہ اپنی پوری طاقت صرف کررہا ہے کہ جس طرح بهی ہوسکے وہ بستی کے غافل لوگوں کو جگادے اور اپنے مشاہدہ کا یقین ان کو دلادے ۔ داعی حق کو اپنی دعوت پر ایسا ہی یقین ہونا چاہئے۔[6] گویا قبول حق اور کفرو انکار کے نتائج کو وہ اپنی آنکهوں سے دیکھ رہا ہے ۔

(ب) ایک نہایت شاداب باغیچے میں ایک گہری خندق ہے جس میں آگ کے بڑے بڑے انگارے دہک رہے ہیں ۔ خندق کے کنارے پهسلوان ہیں ۔ سیر کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہے۔ جس کو خبر ہے وہ سیرکرنے والوں کو پورے یقین کے ساتھ خطرے سے آگاہ کرتا ہے اوراگرباغ کی سیرکرنے والے اس کے دوست اور عزیز قریب ہوتے ہیں تو وہ اپنی پوری طاقت صرف کردیتا ہے کہ ان کو اس خندق کی طرف نہ جانے دے۔

داعی حق باخبر باغبان ہوتا ہے جس کو

---

[5] فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ (شعراءآیت ۳ ، نیز سورہ ۱۸ کہف آیت ۶)

[6] بخاری شریف ص ۹۶۰ حدیث ابی موسیٰ فیہ اناالنذیرالعریان

مخلوق خدا سے ایسی ہی محبت ہوتی ہے، جیسی اپنے اہل و عیال سے ۔ وہ خندق کی طرف جانے والوں کو منع کرتا ہے ۔ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کوکمرپکڑ کر کھینچتا ہے ۔ اس وقت اس کی ہمدردی سراسر اضطراب بن جاتی ہے۔❷ اس کا سوزواضطراب ناقابل بیان ہوتا ہے ۔

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزنہاں جلتی ہے

(۳) داعی حق کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی شوکت و حشمت کے سامنے لوگوں کی گردنیں جھک جائیں ۔ بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی دعوت کی معقولیت، دلائل کی مضبوطی، اس کے اخلاص، قول اور فعل کی صداقت اور اس کی سچی خیرخواہی اورہمدردی، بے لوث زندگی اور بلندی اخلاق کے سامنے لوگوں کے دل جھک جائیں ۔ ان میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہوجائے۔ لہذا سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ :

(الف) کوئی جور اور جبر نہ ہونا چاہئے۔ ہر صاحب فکر کی رائے کو آزادی حاصل ہو۔ وہ خود اچھے برے اور اندھیرے اور اجالے کو پہچانے اور اپنے ضمیر کی شہادت پر عمل کرے ۔

لَااِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۔
(بقرہ۔ ۲۵۶)

(ب) بیشک داعی حق اصلاحی مسائل پیش کرے گا ۔ لوگوں سے مطالبہ کرے گا کہ وہ اس کے اصول تسلیم کریں اور ان پر عمل کریں ۔ لیکن

---

❷ بخاری ص ۹۶۰ حدیث ابی ہریرہ۔

ضروری ہے کہ انداز نہایت سنجیدہ، دانش مندانہ، نصیحت آمیز اور خیرخواہانہ ہو ۔ تبادلہ خیالات اور بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو اس کا انداز اور طرز بھی ایسا حسین ہوکہ اس سے زیادہ نرم، دل کش اورپیار بھرا انداز نہ ہوسکے ۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ ۞ (نحل، ۱۲۵)

(ج) گمراہ، سرکش ، شورہ پشت، شرارت پسند، بدکردار جن کو سیدھے راستہ پر لانا مقصود ہے ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ داعی حق کی بات سنجیدگی سے سنیں گے اور شرافت کا جواب شرافت سے دینگے ۔ باالخصوص ایسی صورت میں کہ ان کی عزت و عظمت، شہرت یا ان کہ کسی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہو تو وہ لامحالہ حق کہ مقابلہ میں اپنی ہرایک شرارت کو کام میں لائیں گے اور پوری قوت سے سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کریں گے ۔ اس صورت میں داعی حق کا فرض کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے : معافی اور درگزر کو اپنا اصول بنالو، نیکی کی ہدایت کرتے رہو اور جاہلوں (نادانوں) سے کنارہ کرتے رہو ۔ (اعراف، ۱۹۸، نحل،۱۲۷، مزمل و مدثر و دہر

۞ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے (اے نبی) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت (دانشمندی) کی باتیں بیان کرو۔ اور اچھے طریقہ پر پبندونصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث ونزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ وہی ہو (اس سے اچھا نہ ہوسکے) تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا اور کون راہ راست پر ہے ۔

وغیرہ)

(۴) اگرچہ قانون یہ ہے کہ برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہوتی ہے وَ جَـزٰٓؤُا سَـيِّئَةٍ سَـيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ ۴۸)

مگر داعی حق اس قانون پر عمل نہیں کرتا بلکہ اس کا اصول یہ ہوتا ہے : بدی کا جواب نیکی سے دیتے ہیں ، بھلائی کرکے برائی کو دفع کرتے ہیں ۔

وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (الرعد۔۲۲)

(۵) عدل کے معنی برابری پیدا کرنے کے ہیں ۔ اسی کو انصاف کہاجاتا ہے، اس سے مساوات تو قائم ہوجاتی ہے مگر بدی ختم نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ بدی کو بڑھاتا اور اس کے دائرہ کو وسیع کردیتاہے ۔ داعی حق کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ بدی اور برائی دنیا سے ختم ہو ۔ لہذا اس کا اصول یہ ہوگا کہ جب کوئی بدی پیش آئے گی تو اس کے اسباب تلاش کرکے ایسا راستہ اختیار کرے گا کہ بدی اور برائی کی جڑکٹے، دوست دشمن بن جائیں ، جو برے ہیں وہ اچھے ہوجائیں ۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (حم سجدہ ۔ ۳۴)

مگر یہ آسان بات نہیں ہے۔ اس کو وہی کرسکتے ہیں جو ضبط و تحمل کے عادی ہوں ۔ جو مکارم اخلاق کے خوگرہوں ۔ (ایضاً آیت ۳۵)

لیکن عالم اسباب میں کسی چیز کی عادت

جب ہی ہوتی ہے جب پہلے اس کی تربیت ہوچکی ہو ۔ مختصر یہ کہ اس دور میں تربیت کا ایک مکمل باب یہ بھی تھا کہ ان کمالات واوصاف کا عادی بنایا گیا جو سب سے افضل اور آخری پیغمبر اور سب سے زیادہ جلیل القدرداعی کے لئے ضروری تھے ۔

ثمرہ تربیت

جن کی فطرت سلیم نے بلادعوت اور بلا فرمائش خود بخود محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کو پوری زندگی کا نصب العین بنایا تھا ۔ اس زمانہ تربیت میں جو رنگ محمد نبی اللہ ﷺ پر غالب آتا رہا اسی رنگ میں یہ بھی رنگے جاتے رہے ۔ ثمرہ یہ ہوا کہ ایک جماعت ایسی تیار ہوگئی۔

۱۔ جو خدا شناس اور سچی خدا پرست تھی ۔
۲۔ جو سب کو چھوڑ کر اپنا رشتہ خدا سے جوڑچکی تھی ۔
۳۔ جس کا پورا بھروسہ اپنے خالق اور مالک پر تھا ۔
۴۔ جس کا دل ہر ایک طمع سے پاک اور صرف اپنے خالق کی محبت سے لبریز تھا ۔
۵۔ جس کے دل پر صرف خالق کائنات کی عظمت کا سکہ تھا، اسی کاخوف اس کے قلب و جگر کا داغ تھا ۔ جس نے خوف خدا کے سوا ہرایک خوف و خطر کے دھبے کو مٹادیا تھا ۔
۶۔ جس کو خالق کی ہر ایک مخلوق سے محبت

تھی، کیونکہ وہ اس کے رب کی پالی ہوئی مخلوق ہے۔ ہر ایک انسان کا درد اس کے دل میں تھا، کیونکہ یہ انسان خدا کی قدرت کا شاہکار تھا جس سے اس کو عشق ہوگیا تھا اور جس کے لئے یہ سب کچھ قربان کردینے کو زندگی کا نصب العین اور دل کی آخری آرزو بناچکا تھا ۔

۷۔ اس جماعت کو ان سے نفرت ہوگئی : (الف) جن کے دل اپنے خالق اور رب کی عظمت اور اس کی مخلوق کے درد سے نا آشنا تھے ۔ (ب) جو خدا کو چھوڑ کر اپنی اغراض کی پوجا میں لگے ہوئے تھے ۔ (ج) جن کو مال اور اولاد پر ناز تھا اور انہی کی ترقی ان کی زندگی کا محبوب نصب العین تھا ۔ (د) جن کو غریبوں سے نفرت تھی کیونکہ وہ دولت سے محروم ہوتے تھے ۔ (ہ) جو یتیموں اور بیواؤں کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے کہ ان کی امداد کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان سے کہیں زیادہ انہیں اپنی تجوریوں سے محبت تھی۔ (و) کمزوروں کی کمزوری سے فائدے اٹھانا ، مخلوق خدا کو غلام اور غلاموں کی زندگی کو اپنی خواہشات کا کھلونا بنانا، ان کی عظمت و برتری کا نشان تھا، جس کو وہ کسی وقت بھی مٹانا یا نیچا کرنا نہیں چاہتے تھے خواہ ان کی جان جاتی رہے ۔

مقامی اور سماجی حالات اور ردعمل

۱۔ عرب میں بادشاہت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ

آزاد ہوتا تھا۔ شیخ قبیلہ اندرونی نظام کا نگراں ہوتا تھا ۔ مکہ میں اس نظام نے چھوٹے سے جمہوریہ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ صدر جمہوریہ تو پھر بھی کوئی نہیں تھا، البتہ قبائل کی ایک مشترک جماعت (کونسل) تھی۔ اس نے شہری، سماجی اور انتظامی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تقریباً ایک درجن شعبے (پورٹ فولیو) بنائے تھے اور ہر شعبہ کا سربراہ منتخب کردیاتھا ۔ مثلاً مقدمات قتل کا ایک خاص شعبہ تھا۔ اس کے سربراہ ابوبکرصدیق تھے ۔ شعبہ سفارت کے ذمہ دار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے ۔ اسی طرح باقی شعبوں کے ذمہ دار علیحدہ علیحدہ تھے ۔ ان میں سے صرف ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ تھے جو سب سے پہلے اسلام لاچکے تھے ۔ عمرفاروق رضی اللہ عنہ کئی سال بعد مسلمان ہوئے ۔ باقی شعبوں کے ذمہ دار یا مسلمان ہی نہیں ہوئے یا اگر مسلمان ہوئے تو بہت آخر میں ۔ اس مشترک جماعت کے اجلا س ہواکرتے تھے ۔ اس مقام کانام "دارالندوہ" تھا ۔

جہاں یہ اجلاس ہوا کرتے تھے، کوئی غیر معمولی معاملہ ہوتا تواراکین کے علاوہ بھی نمایاں افراد کو خاص طور پر مدعو کرلیا جاتا تھا ۔

(۲) حرب بن امیہ، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، عتبہ ربیعہ، ابو لہب، ابو جہل، اُمیہ بن

خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، نضربن حارث، اسود بن عبدیغوث یہ بڑے بڑے دولتمند تھے۔ یہ تاجر بھی تھے صاحب جائیداد بھی، سودی کاروبار بھی بڑے پیمانے پر کرتے تھے اور ان تمام خصوصیتوں کے مالک تھے جو سرمایہ داروں میں ہوا کرتی ہیں مثلاً ابو لہب جو آنحضرت ﷺ کا چچا بھی تھا اور ہمیشہ مخالفت میں پیش پیش رہا، اس کا سودی لین دین وسیع پیمانہ پر تھا اور اس کے حرص وطمع کی یہ حالت تھی کہ اس نے خانہ کعبہ کے خزانہ سے سونے کا ہرن چوری کرکے بیچ ڈالا تھا ۔ یہ ہرن بہت عرصہ سے محفوظ چلاآتاتھا ۔[1]

عاص بن وائل بہت بڑا دولتمند قبیلہ کا مشہور سردار تھا مگر حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے اس پر جھگڑا ہوا کہ انہوں نے لوہے کی کوئی چیز بناکر اس کو دی تھی وہ اس کی اجرت مانگتے تھے اور یہ جان چراتا تھا ۔[2] اور یاد ہوگا یہی عاص بن وائل تھا جس نے یمن کے ایک تاجر کو مارپیٹ کر بھگادیا تھا، جب اس نے اپنے دام مانگے جس سے تمام مکے والوں کی بدنامی ہوئی اور جس کی بنا پر وہ انجمن بنائی گئی تھی جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔[3]

قرآن شریف نے کسی کا نام نہیں لیا مگر اس کے

---

[1] معارف ابن قتیبہ

[2] بخاری شریف ص ۳۰۴ ،

[3] زیر عنوان کمزوروں کی امداد عدل و انصاف اور جذبہ اصلاح ۔

ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج اور معاشرے کا اونچا طبقہ جو مکہ پر چھایا ہوا تھا جو اس لحاظ سے خوش نصیب مانا جاتا تھا کہ ان کے یہاں دولت کے انبار بھی ہوتے تھے اور فرماں بردار اولاد کی بھی کمی نہیں ہوتی تھی، اس کے اخلاق اور اوصاف یہ تھے :

(الف) اپنی اس خوش نصیبی پر کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہیں ان کو گھمنڈ اور غرور ہوتا تھا۔

(ب) جو ان سے کم ہوتے تھے ان کو حقیر سمجھتے اور طرح طرح کے طعنے دیتے تھے۔

(ج) اپنے اثر و رسوخ اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹی قسم کھانے سے ان کو عار نہ آتی تھی بلکہ بڑھ بڑھ کر قسمیں کھاتے ،دوسروں کو لڑانے اور اپنے مخالفوں کو زک پہنچانے کے لئے بے دھڑک چغلیاں اور طرح طرح کا شرارت آمیز پروپیگنڈے کرتے تھے۔[1]

(د) کمزوروں پر ظلم کرنا، ان کی عادت تھی ۔

(ہ) نرم مزاجی اور اخلاق سے ناآشنا تھے۔ نیک کام نہ خود کرتے نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔

(و) غریبوں کی امداد کا کوئی موقع ہوتا تواس میں روڑے اٹکاتے نہ خود خرچ کرتے نہ دوسروں کو خرچ کرنے دیتے۔

(ز) اخلاق سے نا آشنا سخت دل، خشک مزاج طبعیت کے روکھے ۔[2]

---

[1] القلم آیت ۸ تا ۱۵
[2] ایضاً

(ح) رات دن تجوری بھرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ۔ اس تصور سے ناآشنا تھے کہ یہ دولت ختم ہونے والی بھی ہے ۔[3]

(ط) خدا سے بے تعلق، خدا پرستی سے بے گانہ، کج بحث، زبان زوری سے اپنے عیبوں کو چھپانے والے ۔[4]

یہی لوگ تھے جو پورے مکے پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ مکہ ہر لحاظ سے پورے عرب کا مرکز تھا تو ان کے اثرات پورے عرب پر غالب تھے ۔

ایک شخص جس نے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر کا ایک حصہ شہر کی گھلی ملی زندگی میں اس طرح گذارا ہوکہ وہ لوگوں کی آنکھ کا تارا بنارہا ہو ۔ اس کی زندگی میں خاص طرح کی تبدیلی آئے اس کے کچھ ساتھی ہوجائیں ۔ ان میں وہ بھی ہوں جو شہری زندگی میں اونچا درجہ رکھتے ہوں[5] ۔ کچھ مالدار گھرانوں کے نوجوان ہوں[6] اور یہ سب ایک خاص قسم کی انقلاب انگیز زندگی بنانے لگیں ۔ مان لیجئے یہ کسی کو اپنی طرف نہیں بلاتے مگر کیا خود ان کا عمل اور غیرمعمولی انداز لوگوں کو متوجہ نہیں کرے گا ۔ خصوصاً وہ بڑے لوگ جو اپنے اقتدار کو سنبھالنے کے لئے ہر خطرے کے موقع پر خوردبین سے کام لیتے ہیں ۔ کیا وہ ان کے طرز

---

[3] سورہ ۱۰۴ ہمزہ آیت ۲

[4] سورہ ۷۴ مدثر آیت ۱۶ تا ۲۵ و آیت ۴۵ و ۴۶ و سورہ ۸۳ المطففین آیت ۲ و ۳ و آیت ۱۲ و ۱۳ سورہ ۹۶ العلق آیت ۶و ۷

[5] جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

[6] جیسے حضرت عثمان بن عفان، عبدالرحمن بن عوف، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم

زندگی سے ہراساں اور چوکنے نہیں ہونگے اور کیا یہ بات ان کو سراسیمہ اور پریشان نہ کردے گی کہ یہ جماعت جس طرح شرک اور بت پرستی کے خلاف توحید کی قائل اور خدا پرستی کی عاشق ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام حیات سے بھی اتنی ہی متنفر ہے اور جذبات نفرت کی پرورش کررہی ہے ۔

ردعمل :

یہ قدرتی بات تھی کہ سرداران قریش نے جیسے ہی اس چھوٹی سی جماعت کے انداز سے خطرات کو بھانپا ، مخالفت شروع کردی ۔ مگر جس طرح دعوت عام نہیں تھی مخالفت بھی عام نہیں تھی ۔ نجی مجلسوں میں تبصرے ہوتے ۔ بیشک پھیلنے والے اثرات کو زائل کیا جاتا اور مخالفانہ رائے پختہ کی جاتی تھی ۔ مگر گفتگو اور تبادلہ خیالات کے ذریعے مثلاً : سب سے پہلے قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تھی جو ہر ایک صاحب ذوق کو متاثر کردیتی تھی اور جب کوئی صاحب فکر معنی اور مقصد پر غور کرتا تو حیران رہ جاتا اور بسااوقات وارفتہ ہوجاتا تھا ۔ یہ وارفتگی گرویدگی کی حدتک پہنچتی تھی جو اس کو سب سے چھڑا کر حضرت محمد ﷺ سے وابستہ کردیتی تھی ۔ جو حضرات اب تک مسلمان ہوچکے تھے اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی تھی مگر وہ قرآن پاک کی اس تاثیر کی بہترین مثال اور نمونہ تھے۔ قرآن پاک کی اس

تاثیر کو معاذ اللہ جادوکہاجاتا تھاہ کہ یہ منتر ہے جو کسی سے محمدؐ کو ہاتھ لگ گیا ہے وہ اس منتر سے متاثر کرتا رہتا ہے ۔❶

ان تمام آیتوں اور سورتوں میں جن عقائد اور نظریات کی تلقین ہے جب ان پر بحث ہوتی تو بڑے لوگوں کا چلتا ہوا جواب یہ ہوتا تھا : پرانے زمانے کی دقیانوسی باتیں ہیں ، اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب یہ باتیں نہیں چل سکتیں ۔❷

جب خدا پرستی اور توحید کا ذکر ہوتا تو جواب دیا جاتا: اپنے باپ دادوں کے مذہب سے ہٹ کر گمراہ ہورہے ہیں ۔❸

جب ان کی شب و روز کی عبادت اور غیرمعمولی شب بیداری کا تذکرہ ہوتا تو روساءقریش کی مجلسوں میں تبصرہ یہ کیا جاتا : دیوانے ہوگئے ہیں ۔

لیکن ظاہر ہے اس طرح کے جوابات وقتی طور پر کام کرسکتے ہیں ، واقعی اور حقیقی اثرات کو زائل اور سوال کرنے والوں کو مطمئن نہیں کرسکتے ہتواب ان لوگوں نے یہ چاہا کہ اس سے پہلے محمد ؐ کے اثرات متعدی ہوں ، ان سے کوئی سمجھوتہ ہوجائے چنانچہ سرداران قریش

---

❶ سورہ ۷۴ مدثر آیت ۲۴ تنبیہ : سورہ مدثر اور سورہ قلم کی تمام آیتیں اگر چہ ایک ہی دفعہ میں نازل نہیں ہوئیں کچھ پہلے نازل ہوئیں کچھ تھوڑے وقفہ کے بعد، مگر بہرحال تمام آیتیں نبوت کے ابتدائی دور میں ہی نازل ہوئیں ۔

❷ سورہ ۶۸ قلم آیت ۱۵

❸ ایضاً آیت

کـا ایـک وفـد آنحضـرت کی خـدمت میں حاضـر ہوا ۔

ارکان وفد پر ایک نظرڈال لیجئے :

(۱) ولید بن مغیرہ، مکہ کا رئیس اعظم جـو دولت مندی اور خوش حالی کی تمام عظمـتیں اپـنے انـــدر رکھتـــا تھـــا۔ اســـی وجہ ســـے اس کووحیدکہاجاتا تھا ۔

(۲) ابوجہل، سـب سـے زیـادہ ہوشـیار اور چـالاک سردار ۔

(۳) اسودبن عبـدیغوث، مکہ کـا بہت بـڑا تـاجر اور رئیس ۔

(۴) اخنس بن شریق، طائف کـا سـب سـے بـڑا سردار اور رئیس۔

وفد نے آپ کے سامنے تین صورتیں پیش کیں :

- اگـر دمـاغی خلش ہے تـو اجـازت دیجـئے ہم بہترین علاج کا انتظام کریں ۔
- اگر عیش و عشرت مقصود ہے تـو ہم دولت اور حسن دونوں فراہم کرسکتے ہیں ۔
- اگر اقتدار مطلوب ہے تو مکہ کے اقتدار کی باگ ڈور آپ کے حـوالہ کـرتے ہیں ۔ مگـر آپ اپنے انداز کـو ہلکـا کیجـئے ۔ آپ کے نظریـات جو سننے میں آرہے ہیں نہایت سخت ہیں ۔ وہ ہیجان برپا کردیں گے۔

مگر وحی الٰہی نے اسی طرح کی پیش کشوں کی شدت سے تردید کردی ۱۔

تبلیغ کا آغاز

سب سے پہلے اپنا خاندان

حضـــــرت محمد ﷺ کـــــو جب حکم ہوا "قُمْ فَاَنۡذِرۡ"[1]اٹھو اور لوگوں کـو آگـاہ کـرو (کہ ان کے موجودہ عمل اور کردار کا مستقبل کیا ہوگـا) تـو آپ نے انداز اور تبلیغ کا سلسلہ اپـنے خانـدان سـے شروع کیا۔ خدا کا حکم بھی یہی تھا ۔[2]

آپ نے کھانے کا انتظام کیا اور ان رشتے داروں کو دعـوت دی جـو آپ کے پـردادا (دوسـری پشـت کے دادا) ہاشـــم کی اولاد تھے ۔ ان میں وہ بھی تھـا جس کا نام عبدالعزیٰ تھا ۔ اور ابو لہب کی کنیت سے مشہور تھا[1]۔ یہ آنحضرت ﷺ کے والـد ماجـد کـا سب سے بڑا بھائی تھـا ۔ عمـر،سـرمایہ اور دولت کے لحاظ سے خانـدان میں سـب سـے اونچـا تھـا ۔ عبدالعزیٰ سمیت تقریباً چـالیس آدمی اس دعـوت میں آئے ۔ کھانـــا کھایا، پھـــر آنحضــــرتﷺنے کچھ فرمانـا شـروع کیـا ابھی آپ نے بـات پـوری بھی نہیں کی تھی کہ عبدالعزیٰ نے پکار کر کہا :

لھدماســحر کم صــاحبکم[2] (یہ جــادو بہت ہی عجیب ہے جو تمہارے دوست نے تم پر کیا ہے)

---

[1] ســـورہ مـــدثر کی آیت ۱۱ ومن خلقت وحیـــداً کے تحت حضرات مفسرین نے اس کی تصریح فرمائی ہے ۔

[2] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۲

[1] سورہ شعراء۲۶ آیت ۲۱۴ لہب کے معنیٰ آگ کی لپٹ کے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ اس کـا رنـگ سـفید سـرخ تھا، چہرہ انگارے کی طرح دہکتا رہتا تھا اسی لئے یہ کنیت دی گـئی۔ گویا وہ آگ کے انگارے اور لپٹ کی تصویر ہے ۔

[2] البدایہ والنہایہ ص۳۹ ج ۳ و مجمع البحار لفظ هد

جادو کا نام سن کر کون ٹھہر سکتا تھا ۔ مجمع منتشر ہوگیا ۔

ابولہب کی یہ حرکت بہت ہی ہمت شکن تھی ۔ مگر اس کے مقابلہ پر تھی جس کی ہمت نے ٹوٹنا نہیں سیکھا تھا ۔ وہ نئے حوصلے سے اٹھا ۔ کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ دعوت کی اور اس مرتبہ حلقہ وسیع کردیا۔ پہلے ہاشم کی اولاد کو دعوت دی تھی اس مرتبہ ہاشم کے والد عبدمناف کی اولاد کو دعوت دی ۔ اور ابولہب کی پہلی حرکت کا ردعمل یہ ہوا کہ سب ہی آگئے اور آخر تک جمے رہے ۔ آپ نے بھی اپنی بات پوری فرمادی ۔ آپ نے فرمایا:

”میں وہ پیغام پہنچارہا ہوں کہ عرب کے کسی جواں ہمت نے یہ پیغام نہیں پہنچایا تھا ۔ یہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا پیغام ہے ۔ امتہ عرب اس پیغام سے دنیا میں بھی سربلند ہوگی اور آخرت کی کامیابیاں بھی اس کو نصیب ہونگی ❸۔ یہ پیغام عمل کا پیغام ہے انسان کا عمل ہی اس کو کامیاب کرسکتا ہے ۔ ایک کا عمل دوسرے کو کامیاب نہیں کرسکتا۔

اے معشرقریش! اپنے آپ کو جس درجے پر رکھنا چاہتے ہو تو اس کی قیمت خود ادا کرو ۔ عذاب الٰہی سے بچنا چاہتے ہوتو نجات کا سودا تم خود کرو ۔

اے آل عبدمناف ! خدا کے مقابلہ میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاسکتا جب تک تم خود عمل

---

❸ ایضاً ص ۳۹ و ۴۰ ج ۳

نہ کرو۔ میں تمہیں قانون قدرت کی گرفت سے نجات نہیں دلاسکتا۔

اے عباس[4] بن عبدالمطلب ! خدا کے مقابلہ پر میں تمہارے کام نہیں آسکتا ۔ اے رسول خدا کی پھوپھی "صفیہ!" میں اللہ کی گرفت سے تمہیں نہیں بچاسکتا ۔ اے رسول کی بیٹی فاطمہ! میرے مال میں سے جو کچھ مانگنا چاہو مانگو میں دوں گا مگر خدا سے بے نیاز ہوکر میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا ۔ اللہ کے مقابلہ پر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا ۔[5]

تقریر بے حد موثر اور بلیغ تھی۔ سننے والوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا مگر دلوں کا پرانا مرض آسانی سے نکلنے والا نہیں تھا۔ یہاں بھی عبدالعزیٰ ابولہب نے اپنی عمر کی بڑائی اور رشتہ کی برتری سے ناجائز فائدہ اٹھایا ۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس مجمع میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ابولہب تھا اور سب سے چھوٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی عمر تقریباً بارہ سال تھی ۔ بیمار اور کمزور بھی تھے۔ پیٹ بڑھا ہوا، آنکھیں آتی ہوئیں ۔ پنڈلیاں پتلی پتلی، کھڑا ہونا مشکل تھا ۔

آنحضرت ﷺ نے تقریر کے بعد مجمع کی طرف سے جواب کا انتظار کیا تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ (طفل بیمار) نے آپ کی تصدیق کی

---

[4] عباس اگرچہ چچا تھے مگر ہم عمر اور ہم جولی تھے ۔ تقریباً دوسال بڑے تھے

[5] بخاری شریف ص ۷۰۲

اور حمایت کا وعدہ کیا ۔ آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کے الفاظ کہے ۔ ابو لہب کو موقع مل گیا ۔ اس نے طنزکرتے ہوئے قہقہہ لگایا ۔ مجمع کارخ بدل گیا ۔ پھر منتشر ہوگیا ۔❷

صفا کی اسٹیج سے اعلان حق

مکہ کی ایک پہاڑی کانام "صفا" ہے۔ اس پہاڑی کا وجود اب بھی باقی ہے۔ کعبہ شریف سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہے ۔ اب یہ پہاڑی شہر مکہ کی سطح کے برابر ہوگئی ہے۔ مگر اس زمانہ میں یہ بلند تھی ۔ خانہ کعبہ کا حرم ❸(میدان) اس کے دامن میں تھا۔ عام طور پر قریش کی یہاں نشست رہتی تھی ۔ محمد رسول اللہ ﷺ اس پہاڑی پر چڑھے اور قبائل قریش کو نام بنا پکارا ۔ یابنی فہر، یابنی عدی وغیرہ وغیرہ ۔

محمد وہی محمد جن کا اثرواحترام یہ تھا اور قریش کے عوام و خواص اس درجہ گرویدہ تھے کہ آپ کو الصادق اور الامین کہہ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ انہیں الصادق اور الامین کی آواز کانوں میں پڑی تو لوگ پہاڑی کے دامن میں آکر جمع ہوگئے اور جو نہیں آسکتے تھے انہوں نے اپنا کوئی آدمی بھیج دیا ۔

---

❷ البدایہ والنہایہ ص ۴۰ ج ۳

❸ چار دیواری اس زمانہ میں نہیں تھی۔ بیچ میں خانہ کعبہ تھا۔ اس کے چاروں طرف میدان تھا۔ میدان کے کنارے پر روساءمکہ او خدامان کعبہ کے مکانات تھے ۔ میدان میں ان روساءکی نشستیں رہتی تھیں ۔

سب پہنچ گئے تو آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

اگر میں یہ بتاؤں کہ یہ وادی جو اس پہاڑ کی آڑ میں ہے یہاں دشمن کی فوج پہنچ گئی ہے اور وہ عنقریب تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا آپ صاحبان میری بات سچ مانیں گے ؟

سب نے جواب دیا : بیشک آپ کے متعلق ہمارا تجربہ یہی ہے کہ آپ سچ ہی بولتے ہیں [1]

آنحضرتؐ نے فرمایا :

عذاب خداوندی کا لشکر آنے والا ہے اس سے پہلے کہ عذاب کا یہ لشکر آئے میں تمہیں آگاہ کررہا ہوں ۔

آپ نے اسی موضوع پر تقریر فرمائی۔ بہت ممکن تھا لوگ اثر لیتے مگر خاندان ہاشم کا (وہی عمر رسیدہ عبدالعزیٰ ابولہب) بھڑکتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا چل دیا :

”محمد! تیرے ہاتھ ٹوٹیں کیا اس لئے ہمیں یہاں جمع کیا ہے”۔[2]

خاندان کا بڑا پورے خاندان کا سرپرست اور مربی مانا جاتا ہے اور قاعدہ عرب کے مطابق وہ ولی یعنی جواب دہ اور ذمہ دار بھی ہوا کرتا تھا ۔ چھوٹوں کے حق میں اس کی بات مانی جاتی تھی ۔ ابولہب کو یہ ولایت اور سرپرستی حاصل تھی کیونکہ وہ آنحضرتؐ کے والد ماجد کا بڑا بھائی تھا ۔ اس کے علاوہ مکہ کا بااثر دولت مند

---

[1] ماجربنا علیک الاصدقاً بخاری شریف ص ۷۰۲

[2] بخاری شریف ص ۷۰۳

تھا۔ مجمع نے جب اتنے بڑے آدمی کو خفا ہوکر جاتے ہوئے (واک آؤٹ کرتے ہوئے) دیکھا تو مجمع بھی چلدیا ۔ لیکن ذہنوں میں ایک سوال گھر کرچکا تھا (داعی حق کی یہی کامیابی تھی)۔

اتنا اشتعال (بوکھلاہٹ) کیوں ؟

کوہ صفا سے جس نے پکارا وہ وہی محمد تھا جس کا نام لینا لوگ بے ادبی سمجھتے تھے۔ جس کو "الصادق" اور "الامین" کہاکرتے تھے۔ جس سے دعائیں کرایا کرتے تھے۔ برکتیں حاصل کیا کرتے تھے۔ جس نے کچھ عرصے پہلے اس خوفناک ہنگامے کو نہایت خوبصورتی سے ختم کیا تھا جو تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کے سلسلے میں سراٹھاچکا تھا۔

کوہ صفا کی مختصر تقریر میں جن خرابیوں کی طرف آنحضرت ﷺ نے اشارہ کیا ان کا احساس خود قریش کو بھی تھا ۔ انہی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لئے چند سال پہلے وہ انجمن بنائی تھی اور وہ عہدنامہ طے کیاتھا جو حلف الفضول کے نام سے مشہور تھا ۔

یہ ابولہب جو اس وقت سب سے پہلے مشتعل ہوا آنحضرتﷺ کا وہی عم بزرگ ہے جو آنحضرتﷺ کی ولادت پر اتنا خوش ہوا تھا کہ اپنی باندی ثوبیہ کو فوراً آزاد کردیا ۔ اسی ثوبیہ نے سب سے پہلے اس نونہال محمدﷺ کو دودھ پلایا تھا ۔

پھر یہ خفگی اور اتنی بوکھلاہٹ کیوں ؟

اس کا سبب وہ انقلاب تھا جس کی تصویر

اس مختصر جماعت کے آئینے کردار میں ان کو نظرآرہی تھی جو اس چند سال کے عرصے میں (جو تربیت کیلئے مخصوص تھا) محمدﷺ کے دامن میں تربیت پاکر تاریخ عالم کے پلیٹ فارم پر جلوہ گر ہوچکی تھی، جو ایک طرف شرک والحاد کے مقابلے میں توحید، فسق وفجور کے مقابلے میں مکارم اخلاق، حیوانیت اور بہیمیت کے مقابلے میں انسانیت اور شرافت کی علمبردار تھی، تو دوسری جانب راتوں کو اٹھ اٹھ کر کلام الٰہی کی وہ آیتیں بھی گنگنایا کرتی تھی جو مفاد پرست، دولت و ثروت اور ظالمانہ سرمایہ داری کے خلاف گرج رہی تھیں ۔ جس کا کردار یہ تھا کہ اپنی دولت کو راہ خدا میں لٹا کر ان آیتوں کے مفہوم و مقصود کا وہ نقشہ پیش کررہی تھی، جو ان دولت پرستوں کے لئے بہت ہی وحشتناک تھا ۔ جھنجھلاہٹ اور اشتعال کا باعث یہ بھی تھا کہ محمد رسول اللہﷺ کو سمجھانے کی جتنی کوششیں کیں وہ ناکام ہوچکی تھیں ۔

ابولہب جیساسرمایہ پرست جو خزانہ کعبہ کے غزالہ زریں پر بھی ہاتھ ماردے، عاص بن وائل جیسا ذخیرہ اندوز جو مزدور کی مزدوری برسوں تک ٹلاتا رہے ۔ ولید بن مغیرہ جیسا حریص جو سب سے بڑا دولت مند ہونے پربھی صبر نہ کرے، اور اس کی طمع اور لالچ کا جہنم "ہَلْ مِن مَّزِيدٍ" (ق۔۳۰) پکارتا رہے ۔ عتبہ بن ربیعہ اور مسعود ثقفی جیسے جاگیردار جن کی زندگی کا نصب العین ہی جاگیرداری اور زرا ندوزی ہو، ابوجہل

اور عقبہ بن ابی معیط جیسے باغی اور طاغی بڑے بڑے کاروبار کے مالک جو مکہ اور مکہ سے گزر کر پورے عرب پر چھائے ہوئے ہوں سورہ ہمزہ میں انہی جیسوں کے لئے فرمایا گیا ہے:

”جہنم کی ہلاکت اور بربادی ہر ایسے شخص کے لئے جو دوسروں کے عیب نکالے اور ان کو نظرحقارت سے دیکھتے ہوئے طعنے دے ، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مال بٹور رکھا ہے اور اس کو بار بار گنتا رہتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا (اس کی سرمایہ داری پائدار ہوگی)۔ ہرگز نہیں ، بلاشبہ ایسا ہوگا کہ اس کو حطمہ میں ڈال دیا جائے گا ۔ تم جانتے ہو حطمہ کیا ہے؟ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو جھانک[1] لیتی ہے ، بلند اور دراز ستونوں کی طرح اس آگ کے شعلے ہونگے ان لوگوں کوان آتشیں ستونوں میں گھیر کر بند کردیاجائے گا۔ (سورہ ہمزہ)

سورہ ہمزہ کو بار بار پڑھئے آپ کو سرمایہ داروں کے اس غیرمعمولی اشتعال کا سبب معلوم ہوجائے گا ۔ حضرت ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ ابتدائی دورمیں اسلام سے مشرف ہوگئے تھے۔ آپ کی مشہور روایت ہے[2] کہ آنحضرت دیوار

---

[1] ایمان ہوتو نہیں جلاتی کفر ہوتو جلاڈالتی ہے ۔ شاہ عبدالقادر صاحب

[2] ترمذی شریف ص ۷۸ج۱ و مسلم شریف ص ۳۲۰ ج ا وغیرہما

کعبہ کے سایہ میں تشریف فرماتھے ، میں سامنے پہنچا تو آپ فرمارہے تھے "هم الاخسرون و رب الكعبة يوم القيامة" رب کعبہ کی قسم قیامت کے روز یہی لوگ خسارے میں ہونگے ۔

حضرت ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : میں نے یہ الفاظ سنے تو میں چونک گیا ، مجھے خیال ہوا کہیں میرے بارے میں بھی کوئی آیت نازل ہوئی ہے ؟ میں نے عرض کیا :

یارسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان یہ بدنصیب کون ہیں ؟

فرمایا : جو سب سے زیادہ دولت مند ہیں ، صرف وہ مستثنیٰ ہیں جو آگے پیچھے دائیں بائیں سب طرف خرچ کرتے رہیں ۔

تعلیمات کا دوسرا رخ

پڑھنا، لکھنا، تہذیب ،تمدن

۱۔ تخلیق نواز اور انقلاب انگیز تعلیمات کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے ، مشہور مثل "کلام الملوک ملوک الکلام" کی وجد آفرین مثال بھی آپ کے سامنے آجائے گی ۔

وحی کا آغاز لفظ "اِقْرَاْ"سے ہوا ہےاور اس اہمیت کے ساتھ کہ نام رب بھی بعد میں لایا گیا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ"پڑھ اپنے رب کے نام سے" پھر پروردگار (رب) کی تین صفتیں بیان کی گئیں خَلَقَ، الْاَکْرَمُ ، عَلَّمَ زیادہ زور عَلَّمَپر دیا گیا (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔۴ ۔ عَلَّمَ الْاِنسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ) تعلیم دی

قلم کے ذریعے سے سکھایا انسان کو وہ جو نہیں جانتا تھا ۔

کیا اس اسلوب کلام سے ہمیں یہ سبق[2] نہیں ملتا کہ جو شخص اس وحی پر ایمان لائے اس کا پہلا فرض قرأت اور تعلیم ہے[1] اور تعلیم بھی وہ نہیں جو ماں باپ بچوں کو زبانی دے دیتے ہیں

---

[2] جس طرح یہ سبق ملتا ہے کہ معلم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے ۔ وہ انسان کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔ وہ جس طرح قلم کے ذریعے سکھاتا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ امی محض محمد ﷺ کو بلاکسی واسطے کے علم الادلین والآخرین سے نواز دے۔ علق (خون بستہ) یعنی لہو کی پھٹکی۔ اس کو علم سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ خون کی پھٹکی کے لئے علم کا تصور بھی بے محل ہے۔ لیکن خدا قادر پروردگار عالم اس علق سے انسان کو پیدا کرتا ہے اور علم بے پایاں کی دولت سے نوازتا ہے ۔ وہی رب ذوالجلال محمد ﷺ جیسے امی کو جوہر علم سے آراستہ کررہا ہے۔ بلاشبہ کسی امی کونہیں کہاجاسکتا کہ پڑھے پڑھنے کا حکم امی کے حق میں تکلیف مالا یطاق ہے۔ مگر رب محمد کا حکم محمد کے لئے تکلیف مالا یطاق نہیں ہے کیونکہ جوحکم کررہا ہے وہ پہلے ہی محمد ﷺ کو وہ جوہرعطا کرچکا ہے جس نے محمد ﷺ کو خطاب اقرأ کا اہل اور محل بنادیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[1] تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے یہ موضوع بہت دلچسپ ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ اس وقت تعلیم کے بارے میں اقوام عالم کی حالت کیا تھی اور ان کا ذوق تعلیم کہاں تک سرد پڑ چکا تھا ۔ مغربی یورپ، انگلینڈ، جرمنی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے ۔ وہاں تو انسان ابھی پہاڑکی گھاٹی اور پھونس کی جھونپڑی سے بھی نہیں نکلا تھا ۔ رات کو ایک ہی جھونپڑی میں اپنے مویشی کے ساتھ بند ہوتا تھا ۔مشرقی یورپ جہاں "رومن" کا اقبال چمک رہا تھا وہاں بھی علم اور تعلیم کی کچھ دولت تھی تو صرف کلیسا کے تاریک کناروں میں چھپی ہوئی۔ کلیسا سے باہر یا دولت علم سے آشناہی نہ تھے یا تعلیم ان کے لئے ممنوع

بلکہ تعلیم ایسی جس میں پڑھنا بھی ہو اور قلم سے لکھنا بھی ۔
۲۔ کچھ تو قف کے بعد دوبارہ سلسلہ وحی شروع ہوا تو اس کا پہلا لفظ تھا یٰاَیُّہَا الْمُدَّثِّرُ (اے لحاف میں لپٹنے والے)
اس المدثر کو چھ کاموں کی ہدایت کی گئی ۔(۱) دعوت و تبلیغ قُمْ فَاَنْذِرْ (۲) تعظیم رب (عبادت) وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (۳) ظاہر کی پاکی اور صفائی وَ ثِیَابَکَ فَطَہِّرْ (۴) باطن کی پاکی وصفائی وَ الرُّجْزَ فَاہْجُرْ (۵) بے لوث خدمت لَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ (۶) رضاءمولیٰ کو نصب العین بناکر اس پرجم جانے صبر و استقامت سے کام لینا ۔ وَ لِرَبِّکَ فَاصْبِرْ (المدثر۴۔۷)

تھی اور کلیسا کے علماءبھی صرف نفع اندوزی کی حد تک علم کے قدردان تھے ۔ اگر نفع کسی کتاب کی فروخت سے ہوتا یا چمڑے پر لکھی ہوئی کتاب کے حروف مٹاکر چمڑے فروخت کردینے میں نفع ہوتا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے ۔ (موسیولیبان)
ہندوستان کا حال معلوم ہے کہ یہاں صرف براہمن ہند علم کے مالک سمجھے جاتے تھے اور غیربرہمن میں سے آدھی سے زیادہ مخلوق شودر تھی، وہ علم حاصل تو کیا کرسکتی اگر علم کی بھنک بھی کان میں پڑجاتی تو کان میں سیسہ پگھلا دیاجاتا ۔(منوسمرتی)
ایران اور فارس میں عیش پرستی علم پر غالب تھی اور چین و افریقہ کا ماضی ان کے موجودہ حال سے معلوم ہورہا ہے ۔ امریکہ وکناڈا، آسٹریلیا ،ربع مسکون سے خارج تھا تو انسانی دنیا سے بھی خارج تھا ۔

لفظ المدثر❷ سے خطاب اور اس کے بعد یہ احکام کیا ان کا اشارہ یہ نہیں ہے کہ خدا پرستی اور تلاش حق، ہمدوش تہذیب و تمدن ہونی چاہئے ۔

دلیل صداقت ❶

آنحضرت ﷺ کی صداقت کی بہت سی دلیلیں

---

❷ المدثر و ثار سے ماخوذ ہے ۔ وثار کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے لحاف فرمایا ہے کیونکہ وثار اس کپڑے کو بھی کہاجاتا ہے جس سے گرمائی حاصل کی جائے (مجمع البحار)۔ لیکن عرف میں وثار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اس کپڑے کے اوپر پہنا جائے جو بدن سے متصل رہتا ہے۔ جو کپڑا بدن سے لگا رہتا ہے اس کو شعار کہتے ہیں ۔ آنحضرت ﷺ نے حضرات انصار کے متعلق فرمایا تھا "انتم شعاروالناس دثار" یعنی تم میرا وہ لباس ہو کہ اگر تم الگ ہوجاؤ تو بدن ننگا ہوجائے اور دوسرے لوگ اوپر کا آرائشی کپڑا ہیں ۔ وہ اگر الگ ہوجائیں توبدن برہنہ نہیں ہوگا ۔ مختصر یہ کہ دثار میں صرف سترپوشی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایسی آرائش ہوتی ہے جو تہذیب کے تقاضے کو پورا کرے جیسے ہندوستان میں شیروانی یا اچکن اور عرب کے پرانے قاعدے کے مطابق چادر اور دور حاضر میں عبا ۔ پس لفظ المدثر اور اس کے بعد کے الفاظ ثیابک فطهر یہ تصور پیدا کررہے ہیں کہ داعی الی اللہ کو پورے لباس سے آراستہ ہونا چاہئے اور لباس بھی ایسا ہو جو پاک صاف ہو ۔ یعنی اسلام جب رہبانیت یا سادھوپنے کو پسند نہیں کرتا تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ اس کا داعی برہنہ یا صرف سترپوش (لنگوٹی کسنے والا) نیم برہنہ ہو ۔ برہنگی یا نیم برہنگی دونوں حرام ہیں ۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ پورا لباس اسی وقت ہوسکتا ہے جب تمدن اس حد تک پہنچا ہوا ہو کہ کپڑا تیار ہوسکتے وہ سل سکے وغیرہ وغیرہ ۔ پس اس بات سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کلام اللہ شریف کے اس اسلوب خصوصاً ان الفاظ سے جیسے تہذیب و تمدن کی قدر افزائی ہوئی ہے ایسے ہی صنعت و حرفت ، تبادلہ، تجارت

پیش کی گئی ہیں ۔ مستقل کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں ۔ احادیث اور تاریخی روایات کے علاوہ خود قرآن حکیم نے بہت سی دلیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ یہاں صرف دو دلیلیں پیش کی جارہی ہیں ۔ ہر ایک انصاف پسند کے لئے یہ دو دلیلیں کافی ہیں ۔

پہلی دلیل :

خود آپ کی زندگی (صلوات اللہ علیہ وسلامہ ابداً دائماً) آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ ضاللہعنہا کے سامنے بھی آپ کی سابقہ زندگی تھی ۔ اسی زندگی کے معیار پر حضرت خدیجہضاللہعنہا نے غار حرا کے واقعہ کو پرکھا اور غیر اختیاری طور پر آپ کی نبوت کی معترف ہوگئیں ۔ اور جب آپ نے پوری قوم کے سامنے دعوت پیش کی تو وحی خداوندی نے ہدایت کی کہ آپ اپنی قوم سے یہ کہیں کہ یہ دعوت تو میں

وغیرہ ان تمام عوامل کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جوکسی انسان کے "المدثر" لحاف پوش، یا مہذب لباس پوش ہونے کے لئے ضروری ہوں ۔ اور جب سترپوشی فرض ہے تو لباس و پوشاک کا تیار کرنا اور اس کی تیاری کے جملہ ذرائع مہیا کرنا بھی مسلمانوں کے حق میں اجتماعی فریضہ ہوا ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

۵ سیرۃ کی عام کتابوں میں یہ عنوان نہیں ہوتا مگر کتاب اللہ نے آغاز قرآن میں جب نوع انسان کو عبادت کا حکم دیا تو ساتھ ساتھ صداقت کتاب اللہ کی دلیل بھی ایسی پیش کی جس کے ساتھ رسول خدا کی صداقت بھی ضروری ہوجاتی ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے سورہ بقرہ، رکوع ۳

آپ کو پیش کررہا ہوں ۔ لیکن

"واقعہ یہ ہے کہ میں اس سے پہلے تم لوگوں کے بیچ میں اپنی پوری عمر بسر کر چکا ہوں ۔ کیا تم سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے"۔ (سورہ یونس ۱۰ آیت ۱۶)

تشریح : وحی الٰہی کی تلقین یہ ہے کہ محمد رسول اللہ اپنی صداقت کے ثبوت کے لئے لوگوں سے کہیں کہ ساری باتیں چھوڑدو ۔ صرف اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی ہوں ، جس کے حالات و کردار کی تمہیں خبر نہ ہو ۔ مین تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسرکرچکا ہوں ۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی ۔ بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی ۔ تم نے نہ صرف صادق اور امین کہا بلکہ صادق اور امین میرا لقب کردیا۔ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہوسکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں ، تو کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان[1] باندھنے کے

---

[1] تمام علماءاخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق اور خصائل کے ابھرنے اور پنپنے کا اصل زمانہ ہوتا ہے ۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب اور مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ اس خدا پر بہتان باندھنے لگے جس کو وہ اپنا خالق و مالک جانتا ہے ۔ جس کی عظمت کا معترف ہے جس کے قہروغضب سے وہ خود بھی ڈرتا ہے اور لوگوں کو بھی

لئے تیار ہوجاؤ اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کاکلام[2] نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم سمجھ نہیں سکتے ؟

دوسری دلیل خود قرآن شریف (کلام اللہ)

سچے آدمی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل خود اس کی زندگی ہے اور اپنی زندگی کو دلیل صداقت کے طور پر وہی پیش کرتا ہے جو فی الواقع سچا ہو اور اپنی سچائی پر اس کو پورا یقین ہو، جس کے عمل نے کبھی ضمیر سے بغاوت نہ کی ہو، اور جس کا ضمیر اپنے کردار عمل سے ہمیشہ مطمئن رہا ہو۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب، لیکن آفتاب دلیل انہیں کےلئے بن سکتا ہے جو آفتاب کو دیکھ رہے ہیں ۔ جنہوں نے آفتاب نہیں

ڈرارہا ہے جس کی عبادت میں شب و روز مشغول رہتا ہے جس کا ذکر ہروقت اس کی زبان پر رہتا ہے اور ہروقت وہ اپنی کوتاہیوں کی معافی اسی رب سے مانگتا رہتا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے کہ ایک ایک مجلس میں ستر ستر بار الفاظ استغفار زبان مبارک پر آجاتے تھے پھر یہی خدا پرستی اور خدا ترسی کی لگن ہے، جس کی وجہ سے اس کی قوم اس سے ناراض ہورہی ہے اور وہ قوم کی نگاہوں میں معتوب ہورہا ہے۔ کیا یہ شخص جھوٹا ہوسکتا ہے ؟

[2]جب کہ کلام بھی ایسا ہوکہ اس کا کوئی فقرہ بھی خدا کے ذکر سے خالی نہ ہو۔ کہیں اس کے قہرو غضب کا ذکر ہو، کہیں لطف و کرم کا، کہیں اس کے ہمہ گیر علم کو بیان کرکے بتایا گیا ہوکہ انسان جو بھی کرتا ہے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے ۔ انسان کو اپنے ہرفعل اور ہر ایک قول کا جواب دینا ہوگا ۔ وغیرہ وغیرہ

دیکھا انہیں تو کسی اور ہی شاہد کی ضرورت ہوگی ۔ قرآن حکیم (کلام اللہ) کہتا ہے : وہ شاہد میں ہوں ۔ خود اپنی صداقت کی بھی دلیل ہوں اور صداقت محمد ﷺ کی دلیل بھی میں ہی ہوں ۔

وہ عرب جن کو مطمئن کرکے تمام دنیا کے لئے داعی بنانا تھا ۔ کلام الٰہی کا خطاب ان سے ہے ۔

"تم اہل لسان ہو، اپنی زبان کے عاشق ہو، ایسے عاشق کہ شعروسخن ہر ایک کی گھٹی میں پڑا ہے۔ شعروسخن کی یہی گرم بازاری ہے کہ قومی میلوں اور تہواروں کے موقع پر خصوصاً زمانہ حج میں جب عرب کے چنیدہ دماغ منیٰ میں جمع ہوتے ہیں تو کئی کئی روز تک مشاعروں کی محفلیں گرم رکھتے ہوئے ان میں بڑی شان سے مقابلہ کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں ۔ پھر جو قصیدے سب سے اونچے مانے جاتے ہیں ان کی یہاں تک قدر کرتے ہوکہ خانہ کعبہ میں جہاں تمہارے بہت سے معبود رہتے ہیں اس قصیدے کو بھی ایک معبود بناکر آویزاں کرتے ہو اور تمہارے ذوق و شوق کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ماتھا رگڑتے ہو ،ان کو سجدے کرتے ہو اورصرف قصیدے ہی کو نہیں بلکہ شاعر کو بھی غیرمعمولی طاقت کا انسان سمجھنے لگتے ہو کہ اس کے ساتھ جن رہتا ہے ۔ جو ایسا غیرمعمولی شعر اس کو سکھادیتا ہے۔ اب دیکھو "محمد" ﷺ بھی تمہارے سامنے ہیں ، جنہوں نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانو تلمذ طے نہیں کیا۔ کبھی

کسی کی شاگردی نہیں کی، کبھی کسی مکتب میں نہیں پڑھا، کبھی کوئی شعر نہیں کہا، کبھی شعروسخن کی مجلس میں شرکت نہیں کی۔ تم نے اس کو صادق اور امین توکہا مگر نہ کبھی شاعر کہا نہ کبھی خطباءاور مقررین میں ان کو شمار کیا ۔ اس محمدﷺ کی زبان سے ایک کلام تمہارے سامنے پیش کیا جارہا ہے ۔ محمد کہتے ہیں کہ یہ کلام میرا نہیں خدا کا کلام ہے جو میرے اوپر نازل ہوتا ہے جیسا نازل ہوتا ہے بجنسہ اور بعینہ آپ کو سنا دیتا ہوں ۔ پس

> "اگر تمہیں اس کلام کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے (اللہ تعالیٰ)اپنے بندے محمدﷺ پر نازل کیا ہے تو اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ اگر یہ محض انسانی دماغ کی بناوٹ ہے تو تم بھی انسان ہو ، زیادہ نہیں ، اس جیسی صرف ایک ہی سورت بنا لاؤ (اگر تمہارا عقیدہ ہے کہ جنات شعراءکے مددگار ہوا کرتے ہیں تو تم ایسا کروکہ) اللہ کے سوا جن (طاقتوں) کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے، ان سب کو بھی اپنی مدد کے لئے بلالو ۔اگر تم سچے ہوتو ایسا ضرور کرلو ۔ اور اگر تم ایسا نہ کرسکو اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہ کرسکو گے تو اس آگ کے عذاب سے ڈرو جو (لکڑی کی جگہ) انسان اور پتھر کے ایندھن سے سلگتی ہے اور منکرین حق کے لئے تیار کی جاچکی ہے۔ " (سورہ بقرہ ۲ آیات ۲۳)

کلام اللہ کی شوکت وقوت اور اپنی صداقت کا یقین حیرت انگیز ہے۔ ایک شخص جس کے ساتھ صرف چند افراد ہیں ، جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، وہ نہ صرف قریش کو نہ صرف اہل مکہ کو بلکہ ہر ایک عربی بولنے والے بلکہ پوری دنیا میں جو بھی شک و شبہ کرنے خواہ وہ کوئی ہو، ان سب کو چیلنج کررہا ہے۔ چیلنج معمولی نہیں ہے، ایسا سخت اور تلخ چیلنج جو معمولی سے معمولی انسان کی غیرت کو بھی اس درجہ مشتعل کردے کہ وہ اپنے تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لاکر چیلنج کا جواب دینے کیلئے بوکھلاجائے ۔ مضمون دوبارہ ملاحظہ فرمائیے :

”اگر تم اس چیلنج کو قبول نہیں کرسکتے اور اس جیسی کوئی ایک سورت نہیں لاسکتے تو یقین کرلو کہ تم باطل پر ہو ۔ تم حق کا مقابلہ کررہے ہو۔ تم عذاب الٰہی کے مستحق ہو تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا، جس کا ایندھن تم جیسے انسان اور پتھر ہونگے“ (بقرہ۔۲۳،۲۴)

قرآن حکیم کی ایک سورت ۱۰۸ سورہ کوثر بھی ہے۔ جس میں صرف تین آیتیں (جملے) ہیں جن کے کل الفاظ (کلمات) اٹھارہ ہیں ۔

چیلنج کا خلاصہ یہ ہے کہ حق و باطل اور سچائی اور بناوٹ کا فیصلہ اس پر ہے کہ تم صرف ایسا کلام پیش کردو جو ۱۸لفظوں پرمشتمل ہو ۔ مگر وہ اپنے ظاہری اور معنوی

کمالات میں اس جیسا ہو؟ تمام دنیا کے ادیبوں
کی مجلسیں اور شعرو سخن کے کمالات کا
فیصلہ کرنے والے جج موجود ہیں ، کسی بھی
عدالت، کسی بھی ادبی مجلس میں موازنے کے
لئے پیش کردو ، اگر تمہارے حق میں فیصلہ
ہوجائے تو مان لیاجائے گا کہ یہ کلام، اللہ کا کلام
نہیں ہے محمد کی من گھڑت ہے (معاذ اللہ)۔

پھر یہ چیلنج صرف ایک مرتبہ اتفاقی طور پر
نہیں بلکہ مختلف عنوانوں سے باربار دہرایا گیا
اور اسی قوت کے ساتھ دہرایا گیا مثلاً :

(۱) سورہ ہود مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے
اس کی آیت ۱۳ جو اس سلسلے کی سب سے
پہلی آیت ہے اس کا ترجمہ یہ ہے ۔

" کیا لوگ ایسا کہتے ہیں کہ محمد نے یہ
قرآن اپنے جی سے گھڑ کر خدا پر بہتان
باندھا ہے ، آپ کہہ دیجئے اگر تم اپنی اس
بات میں سچے ہو تو اس طرح کی دس
سورتیں گھڑی ہوئی بناکر پیش کردو اور
اللہ کے سوا جس کسی کو اپنی مدد کے لئے
پکارسکتے ہو اس کو پکارلو ۔"

پھر دوآیتوں کے بعد آیت ۱۶ کا ترجمہ یہ ہے :

"یہ لوگ (جو صرف دنیاوی مفاد اور
آسائش کے لئے حق سے اعراض کرتے ہیں
اور اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں مانتے)
یہی وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے
سوا کچھ نہ ہوگا ۔ "

(۲) سورہ ۱۰ یونس بھی مکہ میں نازل

ہوئی۔ اس کی آیت ۳۸ میں بھی اس چیلنج کو دہرایا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے :

”کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کے نام پر یہ بہتان باندھا ہے؟ تم کہہ دو اگر تم اس قول میں سچے ہو تو قرآن کی مانند ایک سورت بناکر پیش کردو ۔ اور خدا کے سوا جن جن ہستیوں کو اپنی مدد کے لئے بلاسکتے ہو (تمہیں پوری اجازت ہے) بلالو“(آیت ۳۸)

(۳) پہلے دس سورتوں کا مطالبہ کیاگیا تھا ۔ اس مرتبہ صرف ایک سورت کا ۔ پھر سورہ ۵۲ طور میں “سورہ” کا لفظ بھی نہیں بلکہ حدیث (کلام، بات) کا لفظ آیا ہے :

فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ الخ آیت ۳۴ اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں اگر سچے ہیں ۔

(۴) سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۸میں یہ اعلان کیاگیا :

”اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہوکر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام پیش کردیں تو کبھی بھی پیش نہیں کرسکیں گے ،اگر چہ ان میں سے ایک دوسرے کا مددگار ہی کیوں نہ ہو۔“

(۵) یہ آیتیں وہ ہیں جن میں یہ چیلنج صراحت کے ساتھ کیاگیا :

”اس جیسا قرآن پیش کردیں “ (۱۷/ ۸۸)

”دس سورتیں بنالائیں “ (۱۱/ ۱۳)

”ایک سورت بنا لائیں “ (۱۰ / ۳۸)

"ایک سورت بنا لائیں " (۲ / ۲۳)

"اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں " (۵۲/ ۳۴)

ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں بطور اشارہ و کنایہ اس چیلنج کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس چیلنج کے مخاطب عرب کے وہی فصحاءاور بلغاءہیں جن کو اپنی ادبیت اور فصاحت و بلاغت پر ناز تھا، جو اپنے زمانے میں بھی عربی ادب کے استاد مانے جاتے تھے اور آج بھی استاد مانے جاتے ہیں ۔ کیا قرآن پاک اور قرآن پاک کے پیش کرنے والے محمد ﷺ کی صداقت کے لئے یہ آفتاب جیسی کھلی ہوئی دلیل کافی نہیں ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا جس میں اکثر یت قرآن اور اسلام کے مخالفین کی ہے چودہ سو برسوں سے اس چیلنج کو سن رہی ہے۔ مگر اس کو منظور کرنے سے آج بیسویں صدی عیسوی میں بھی اسی طرح عاجز ہے جیسے ساتویں صدی عیسوی میں عاجز تھی جب یہ قرآن نازل ہورہا تھا ۔

قریش جو اس کے مخاطب اول تھے ان سے یہ نہ ہوسکا کہ ۱۸ لفظ کا کوئی مرتب کلام اس چیلنج کے جواب میں پیش کرسکیں ۔ اس کے سوا جو کچھ تدبیریں وہ کرسکتے تھے وہ سب کرلیں ۔ مثلاً منصوبہ بند طریقہ سے ممانعت کردی کہ کوئی قرآن نہ سنے اور جب محمد ﷺ نے بازاروں ، میلوں اور پبلک مقامات پر کھڑے ہوکر سنانا شروع کیا تو منصوبہ یہ تھا کہ اتنا شور مچایا جائے کہ محمد ﷺ کی آواز کسی کے کان میں

نہ پڑسکے ۔❶

اگر کوئی اجنبی شخص اس شور و غل پر اعتراض کرنے لگے تو کبھی کہہ دیا جائے معاذ اللہ مجنون ہوگیا ہے، کبھی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ جادوگر ہے۔ یہ منتر پڑھتا ہے تو ماں بیٹے سے نفرت کرنے لگتی ہے ، بیوی اپنے شوہر سے اور بھائی بھائی سے جدا ہوجاتا ہے۔❷

یہ ابتدائی تدبیریں تھیں ، پھر جو کچھ کیاگیا، اسلام لانے والوں کو طرح طرح ستایا گیا ، پھر ان کا بائیکاٹ کیاگیا ، ان کو ترک وطن پر مجبور کیاگیا اور جب وطن ترک کرچکے تو مدینہ پر بار بار حملے کرکے ان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی ، یہ سب کچھ کیاگیا مگر یہ نہ ہوسکا کہ قرآن حکیم کے چیلنج کا جواب دے دیں اور ایک سورت اس کے مقابلے میں پیش کرکے صداقت قرآن اور صداقت محمد کی تردید کردیں ۔

یہ صداقت کی دوسری دلیل تھی جو آنحضرت ﷺ نے پیش کی اور یہ دلیل جس طرح آنحضرت ﷺ کے ورود مسعود میں برہان قاطع اور حجة کاملہ تھی، آج چودہ سو برس کے بعد ایسی ہی درخشاں اور تاباں دلیل ہے، جو پوری دنیا کو للکاررہی ہے۔

" قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ

---

❶ حم سجدہ آیت ۲۶

❷ سورہ ۵۱ الذاریات آیت ۵۲،سورہ ۵۲ الطور آیت ۲۹ وغیرذٰلک

لِبَعْضٍ ظَہِیرًا﴿۸۸﴾ (بنی اسرائیل ۸۸)❶

ضمیر سے بغاوت کی یہ بدترین مثال تاریخ نے فراموش نہیں کی کہ قریش کے یہی سرغنے ابوجہل ، اخنس بن شریق اور ابو سفیان جو دوسروں کو قرآن شریف سننے سے منع کرتے تھے راتوں کو چھپ چھپ کر خود قرآن شریف سناکرتے تھے ۔ رات کے آخری حصے میں جب رسول خدا ﷺ بھینی بھینی آواز سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت صداءپر سوز میں عجیب کیفیت پیدا کردیتی تھی۔ جو ایک دفعہ سن لیتا وہ بار بار سننے کے لئے بے چین رہتا۔ان سرداروں کو کسی طرح سننے کا اتفاق ہوگیا تو پھرجب موقع ملتا خلوت کدے کے آستانہ مبارک پر پہنچ جاتے اور کان لگائے سنتے رہتے۔ کبھی آپس میں مڈبھیڑ بھی ہوجاتی تو ہر ایک دوسرے کو ملامت کرتا۔ مگر یہ ایک ایسا جرم تھا جس سے باز رہنا مشکل تھا ۔ البتہ نوجوانوں کو منع کرتے ہیں ۔ سب کا اتفاق تھا کہ اگر وہ گرویدہ ہوگئے تو ہماری طرح اپنے ضمیر سے بغاوت نہیں کرسکیں گے ۔❷

---

❶ اگر تمام انسان اور سارے جن اس پر متفق ہوجائیں کہ اس قرآن جیسا قرآن پیش کردیں تو وہ اس جیسا قرآن پیش نہیں کرسکیں گے ۔ خواہ وہ اس میں ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں ۔

❷ سیرۃ ابن ہشام ص ۱۹۳ ج ا، البدایہ والنہایہ ص ۶۴ ج ۳، الاصابہ ص ۲۳۱ ج ا ،ذکر اخنس بن شریق

محمد ﷺ کی حیثیت

فرائض اور خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے "محمد" ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

یٰاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا۴۶

(سورۂ احزاب، ۴۵، ۴۶)

اے نبی ہم نے تم کو بھیجا ہے اس شان سے کہ آپ

۱۔ شہادت دینے والے ہیں

۲۔ بشارت دینے والے ہیں

۳۔ آگاہ کرنے والے ہیں

۴۔ خدا کی طرف بلانے والے ہیں

۵۔خدا کی طرف سے دعوت دینے کے مجاز ہیں

۶۔ چراغ ہیں روشنی دینے والے ۔

یہ معجزانہ بلاغت ہے کہ خطاب ایسے الفاظ سے کیاگیا جس سے یہ بنیادی حیثیت پہلے ظاہر ہوگئی کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں ۔ اس کے بعد مندرجہ بالا چھ خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں ۔

پہلی خصوصیت اورنبی اور فلسفی کا فرق :

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ حق بات کو اس یقین اور ایسے وثوق اور بھروسے سے بیان کرتے ہیں جیسے کوئی آنکھوں دیکھی چیز کی شہادت دیتا ہے ۔

یہ فرق ہے نبی اور فلسفی میں ۔ فلسفی کے پاس قیاس، تخمینہ اور تجربہ ہوتے ہیں ۔ تجربوں کی بنیاد اگر چہ بسااوقات مشاہدہ پر ہوتی ہے مگر انسان کا مشاہدہ بھی بسااوقات غلطی کرتا ہے ۔

ہزاروں برس تک دنیا کے فلسفی جن میں سقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے ماہر بھی داخل ہیں جو فلاسفہ کے امام مانے جاتے ہیں ۔ یہی یقین کرتے رہے کہ چاند اور سورج آسمانوں میں گڑے ہوئے ہیں ۔ آسمان زمین کو گھیرے ہوئے ہیں اور وہ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں ۔ زمین اپنی جگہ ساکن ہے یہ نہ حرکت کرتی ہے نہ کرسکتی ہے ۔ یہ سب کچھ وہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہتے رہے۔ ان کی عظیم الشان رصد گاہیں اسی یقین کی تصدیق کرتی رہیں اور اپنے اس یقین کی بناءپر انہوں نے نجوم ، جوتش وغیرہ بہت سے فن ایجاد کئے اور یقین کرتے رہے کہ یہ تمام فنون اور ان کی یہ تمام تحقیقات صحیح اور درست ہیں ، ان میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے[1] مگر آج سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جو کچھ تھا فریب نظرتھا۔ آج کی دنیا میں اس سے بڑا احمق اور جاہل کوئی نہیں جو آسمان کو گھومتا ہوا مانے اور چاند سورج کو اس میں جڑا ہوا سمجھے ۔

---

[1] ان کے اس یقین میں بسااوقات جارحیت ہوتی تھی۔ وہ اپنے مخالف کو سخت سزا کا مستحق سمجھتے تھے۔ انہیں کے پیش رو وہ تھے جنہوں نے حضرت ابراہیم علیسلم کو نذرآتش کرنے کے لئے جہنم تیار کیا تھا ۔

ان فلاسفہ کو پورا یقین تھا کہ ہماری زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ فوراً ہی فنا ہوجاتے ہیں ۔ ان کے فلسفی ضابطے کا فیصلہ یہی تھا کہ حرکت اور اس کے اثرات کا کوئی اپنا وجود ہی نہیں ہے۔ لہذا ان کے بقاءکا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ ہماری آواز اور ہمارے الفاظ زبان کی حرکت کا اثر ہے جو ساتھ ساتھ ختم ہوتا رہتا ہے۔ لیکن آج مشاہدہ یہ ہے کہ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے باقی رہتا ہے اور کہاجاتا ہے کہ جو الفاظ انسانوں کی زبان سے بولے گئے وہ سب فضا میں موجود ہیں ۔

بہرحال سابق فلاسفہ نے جو باتیں صرف ذہانت سے معلوم کی ہیں اور موجودہ فلسفی جن باتوں کا مشاہدہ کررہے ہیں ان تمام تحقیقات اور مشاہدات کے باوجود یہ سب قدیم اور جدید فلاسفہ اور ماہرین سائنس یہی سمجھتے رہے اور یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہماری تحقیق ہے وہ حرف آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی جدید تحقیق اس تحقیق کو غلط قرار دے دے۔ لہذا یہ یقین کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی حرف آخر ہے اور وہی حق ہے اس کے سوا باطل ہے یہ یقین فلسفی کو میسر نہیں آتا۔ اس کو خود اپنی تحقیق کے اندرشک رہتا ہے۔ اس بناءپر وہ اطمینان سے محروم رہتا ہے۔ اور جب اطمینان کی دولت خود اس کے پاس نہیں ہوتی تو وہ کسی دوسرے کو یہ دولت کہاں سے دے سکتا ہے؟ اور جب اس کو اپنی تحقیق پر

مکمل اطمینان اور یقین نہیں ہوتا تو اس کے لئے فدا ہوجانے اور قربان ہونے کا جذبہ بھی اس کے اندر نہیں ہوتا۔ لہذا عمل کے لحاظ سے وہ عموماً کوتاہ رہتا ہے ۔

مادے کی طرح روح اور خدا سے تعلق رکھنے والے مسائل (مثلاً خالق کائنات کی ذات و صفات ، اس سے انسان کا تعلق ، حیات بعد الممات ، عمل اور پاداش عمل جیسے مسائل) میں بھی فلسفی کا فیصلہ دوٹوک نہیں ہوتا ۔ اس کا ترقی پذیر دماغ جس چیز کو آج روشنی سمجھتا ہے وہی چیز اگلے روز اس کو تاریک نظرآتی ہے اور سکون و اطمینان کے بجائے اس کا دماغ نئے خلجان میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے پیروکار جو بصیرت سے محروم اور اندھی تقلید کے عادی ہوں فلسفی کے کسی نظریے کے معتقد ہوجائیں ، مگر ان کی یہ تقلید بھی شک و شبہ کی گرد سے پاک نہیں ہوسکتی۔ اور یہی سبب ہوتا ہے کہ اس کے مخالف اور متضاد نظریے کو بھی[1] حق سمجھنے لگتے ہیں ۔ قرآن حکیم میں بار بار کہاگیا ہے کہ ان عقل پرستوں کے پاس جوکچھ ہے وہ "ظن" ہے جو شک و شبہ اور

---

[1] برادران وطن کے دھرم کا مداروحی پر نہیں ہے کیونکہ وہ نبوت کو نہیں مانتے ان کے دھرم کا مدار فلسفہ پر ہے وہ اپنے رشیوں اور منیوں کو فلسفی ہی مانتے ہیں ۔ اسی کا اثر ہے کہ کسی ایک عقیدے اور نظریے پر ان کو یقین نہیں ہوتا وہ ہر ایک عقیدے کو صحیح ماننے لگتے ہیں ۔ وہ اس کووسعت نظر اور فراخی ظرف سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا سبب گم گشتگی نظر اور فقدان یقین ہے ۔

خلجان کے گردوغبار سے پاک اور صاف نہیں ۔ جہاں حق کی ضرورت ہو وہاں ظن کام نہیں دے سکتا ۔[2]

مکڑی کا جالا کرم شب تاب کو الجھاتو سکتا ہے اس کو منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ قطب مینار کی بلندی تک وہی رسی پہنچا سکتی ہے جو نہایت مضبوط ہو۔ نبی کے پاس حق اور یقین کی یہی مضبوط رسی ہوتی ہے جو اس کو اس کا رب اور معبود عطا کرتا ہے ۔[3] اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ رسی خود اس کے رب کی عطا کردہ ہے ۔ وہ اپنی جان قربان کرسکتا ہے مگر اس رسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اس یقین کا ثمرہ وہ غیرمعمولی اعتماد اور توکل ہوتا ہے جونبی کو اپنے رب پر ہوتا ہے۔ جو بڑی سے بڑی جابر و ظالم طاقت کے مقابلے میں بھی اس کو پہاڑ کی چٹان بنائے رکھتا ہے اور سخت سے سخت خطرے کے موقع پر بھی اس کا تصور یہ ہوتا ہے ۔

”ہم خدا پر اعتماد اور بھروسہ کیوں نہ کریں جن کا (فضل وکرم یہ ہے کہ روحانی اور مادی زندگی کے) تمام راستوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی۔ بلاشبہ ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہم ان تمام اذیتوں کے مقابلہ پر استقلال اور ضبط و تحمل سے کام لیں جو تم ہمیں پہنچا رہے ہو اور اللہ ہی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو

---

[2] سورۃ النجم ۲۸ ۔

[3] سورہ بقرہ آیت ۲۵۶ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى

بھروسہ کرنا چاہئے”۔ (سورہ ابراہیم ۱۱)

مختصر یہ کہ اللہ کے رسول ؐ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاہد ہیں یعنی جو کچھ بتاتے ہیں وہ ایسے یقین کے ساتھ جو مشاہدہ سے بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے، جس کی پشت پر حق و صداقت کی سرفروشانہ اور فداکارانہ پختگی ہوتی ہے ۔

دوسری خصوصیت :

یہ کہ جو لوگ اس حق و صداقت کو قبول کرلیتے ہیں ان کو پہلی بشارت[1] یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے سچائی کا راستہ پالیا اور خدا پرستی کے جس صراط مستقیم کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے وہ صراط مستقیم ان کو مل گیا ۔ وہ تشنہ کام ، جو تلاش حق میں سالہا سال سے سرگرداں رہے ان کیلئے اس سے زیادہ بشارت کیا ہوسکتی ہے کہ وہ گوہر مراد ان کے دامن میں آگیا جس کے لئے وہ بے چین تھے اور جس کی جستجو میں وہ اپنی عمر کھپا رہے تھے ۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ اس کے بہترین فوائد اورنتائج ان کو موجودہ زندگی میں بھی میسر آئیں گے اور اس عالم میں بھی میسر آئیں گے جہاں حق و باطل کا فیصلہ ہوگا۔ جہاں کی زندگی حقیقی زندگی ہے اور جہاں کی کامیابی ابدی کامیابی

---

[1] ایک سبق: نبی اور نہ صرف نبی بلکہ ہرایک داعی حق کا یہ کام ہے کہ وہ پرامید رہے اور جس کو وہ دعوت دے تو پہلے اس دعوت کے فائدہ بخش اور روشن پہلو اس کے سامنے رکھے ۔

ہے ۔

تیسری خصوصیت:

یہ کہ جو لوگ سچائی کے سامنے گردن نہ جھکائیں جو اس سے منہ موڑیں ان کو آگاہ کردیں کہ وہ موجودہ اور آخرت کی زندگی کی کامیابیوں سے منہ موڑ رہے ہیں ۔ اس کے بدترین نتائج اس زندگی میں بھی ان کے سامنے آئیں گے اور اس زندگی میں بھی جو حقیقی زندگی ہے۔ آپ کی حیثیت یہ ہے کہ آپ نذیر ہیں (آگاہ کرنے والے)

چوتھی خصوصیت:

یہ کہ آپ داعی الی اللہ ہیں ۔

پانچویں خصوصیت:

یہ ہے کہ آپ محض فطری خیراندیشی اور خیرسگالی کی بنا پر دعوت نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس جلیل اور عظیم خدمت کے لئے مامور ہیں ۔

چھٹی خصوصیت :

وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی کالب لباب ہے۔ آپ کی تمام سوانح حیات ان دو لفظوں میں سموئی ہوئی ہے کہ آپ سراج منیر ہیں ، یعنی نوع انسان کی محفل میں رونق افروز ہیں ۔ مگر اس طرح کہ سراسر سوزوگداز ہیں اور یہ سوزوگداز ہی وہ نور ہے، جو

دوسروں کو روشن کررہا ہے۔

اس چھٹی خصوصیت کا مشاہدہ کرانے کے لئے حیات مقدسہ کی مختصر سوانح آئندہ صفحات میں پیش کی جارہی ہے ۔ (واللّٰہ الموفق وھوالمعین)

شمع سوزاں اور سراج منیر کو گل کرنے کی کوشش

وہی محمدﷺ، سرداران قریش جس کو الصادق اور الامین کہاکرتے تھے اس کی مقدس تعلیم کو جب انہوں نے اپنے مفادات کے لئے خطرہ عظیم اور برق خرمن سوز سمجھا تو اب رات دن ان کی کوشش یہ تھی کہ اس آواز کو دبائیں اور اس شمع کو گل کردیں ۔ چنانچہ باپ دادا کے مذہب قدیم کے نام پر عوام میں اشتعال پیدا کردیا۔ جس پر وہ آنحضرتﷺ اور گنے چنے مٹھی بھر مسلمانوں کے درپے ہوگئے۔ اس کے علاوہ خود ان کی سرگرمیاں نئے نئے ستم ایجاد کرنے میں مصروف رہنے لگیں ۔ خانہ کعبہ کا حرم محترم جہاں خود ان کے عقیدے کے بموجب کسی بھی جاندار کو ستانا گناہ تھا ،محمد رسول اللہ ﷺ وہاں اپنے رب کی عبادت کرتے تو ستائے جاتے اور طرح طرح سے ستائے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا : اگر میں نے دیکھ لیا کہ حرم کعبہ میں محمد اپنا چہرہ زمین پر رکھے ہوئے ہیں تو میں اسکی گردن اپنے پیرسے روند

دونگا [1]۔ ابوجہل نے تو ایسا نہیں کیا لیکن اس کا دوست عقبہ بن ابی معیط اس سے بھی زیادہ حرکت کرگزرا ۔

آنحضرت ﷺ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے عقبہ بن ابی معیط نے چادر گردن میں ڈالدی اور اتنی زور سے اس کو اینٹھا کہ محبوب خدا ﷺ کا سانس گھٹ گیا آنکھیں باہر کو آنے لگیں ۔ اتفاق سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے۔ عقبہ کو دھکیل کر پیچھے کیا چادر گردن مبارک سے ڈھیلی کی اور ان دشمنان حق سے کہا :

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ (المومن۔٢٨)

”کیا تم ایک آدمی کو اس پر قتل کررہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے وہ روشن دلیلیں لایا ہے جن کا تم انکار نہیں کرسکتے ۔“ [1]

خانہ کعبہ کے قریب اکثر سرداران قریش کی نشست رہتی تھی۔ ایک روز آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے، ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا : فلاں محلے میں اونٹنی ذبح ہوئی ہے ایسا کرو کہ اس کا بچہ دان [2] اٹھالاؤ اور محمد کے سرپر رکھ دو ۔ یہی بدبخت عقبہ بن ابی معیط کھڑا ہوگیا ۔ اس محلے میں گیا، بچہ دان اٹھواکر لایا اورجب آپ سربسجود تھے پورا ملغوبا سرمبارک

---

[1] بخاری شریف ص ۷۴۰ الاطئن عنقہ ١٢

[1] بخاری شریف ص ۷۱۱

[2] سلا جزور سلابچہ دان (بخاری شریف وغیرہ)

پر ڈالدیا۔ آنحضرت ﷺ کو حرکت کرنی مشکل ہوگئی (یا بارگاہ خداوندی میں مظلومانہ التجا کے لئے قصداً حرکت نہیں کی) مگر یہ بدبخت اپنی اس بدمستی پر خوش تھے اور قہقہے مارتے ہوئے ایک دوسرے پر ڈھلک رہے تھے ۔ آنحضرت ﷺ کی چھوٹی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر ہوئی وہ دوڑی ہوئی آئیں اور گندگی کے اس بوجھ کو سرمبارک سے ہٹایا ۔❸

جب حرم پاک میں رہنماؤں اور سرداروں کی یہ حرکتیں تھیں تو مکہ کے عوام، مکہ کی گلیوں ، کوچوں میں جو کچھ کر گزرتے کم تھا ؟چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اوپر سے کوڑا کرکٹ جسد اطہر پر ڈالا گیا اور ایک پڑوسی عورت کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھادیا کرتی تھی ۔❹

---

❸ بخاری شریف ص ۳۷ آنحضرت ﷺ کو جو تکلیف پہنچائی جاتی تھی آپ اس کا انتقام تو کیا لیتے کبھی بددعا بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ حقوق اللہ کی توہین کی جاتی تھی تو آپ بے چین ہوجاتے تھے اور اس وقت بددعا کے الفاظ بھی زبان مبار ک پر آجاتے تھے ۔ یہاں اس وقت جو کچھ کیاگیا اس میں اول حرم کعبہ کی توہین تھی جو خود عقیدہ قریش کے بموجب بھی حق اللہ کی توہین تھی، دوم یہ کہ بارگاہِ خدا میں سجدہ ریزی کی توہین تھی جس کو ہر ایک سلیم الفطرت انسان کی فطرت حق اللہ کی توہین سمجھتی ہے۔ چنانچہ اس موقع پران سرداران قریش کے حق میں آپ کی زبان سے بددعائیہ کلمات نکلے اور وہ اس طرح پورے ہوئے کہ یہ سب سردار جنگ بدر میں مارے گئے ۔ (بخاری شریف ص ۳۷)

❹ یہ ابو لہب کی بیوی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی بھی ہوتی تھی اور اس نے آپ کو بچپن

اس قسم کی حرکتیں خدا جانے کتنی ہوئیں اور لطف یہ ہے کہ یہ حرکتیں اصل پروگرام سے زائد تھیں ۔

منصوبہ بند کوششیں

ابھی آنحضرتؐ نے دعوت نہیں دی تھی ۔ آ پ خاموشی سے ذکر و فکر اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تربیت میں مصروف تھے۔ اس وقت بھی قریش کے تاڑنے والوں نے یہ کوشش کی تھی کہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے اور محمد رسول اللہ ؐ سے کسی طرح کی مفاہمت ہوجائے۔ مگر ان کی یہ کوششیں ناکام رہی تھیں ۔ لیکن جب آنحضرتؐ نے پورے قریش بلکہ پورے عرب کو مخاطب کرکے تبلیغ شروع کی تو مخالفانہ کوششوں کا بھی نیا دور شروع ہوا۔

قریش کے لئے یہ سوال بہت اہم اور بہت پیچیدہ تھا کہ جس کا وہ احترام کرتے رہے تھے اور جس کو الصادق اور الامین کہا کرتے تھے اب اس کی تردید کس طرح کریں اور عوام کو کس طرح مطمئن کرکے الصادق اور الامین کے خلاف مشتعل کریں ۔ حج کا زمانہ قریب آیا تو یہ سوال بہت اہم ہوگیا، کیونکہ یہ یقین تھا کہ محمد ؐ اس اجتماع عظیم سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے قبائل مکہ کے ذمہ داروں کا اجتماع کیا گیا۔ بحث و مباحثہ کے بعد طے کیاگیا کہ پہلے محمد ؐ سے الگ گفتگو کرلی جائے ۔ ولید بن مغیرہ[1] کو گفتگو کے لئے منتخب کیاگیا۔ ولید بن مغیرہ مکہ کا سب سے بڑا

میں گود کھلایا بھی تھا ۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۳۴ج ا)

دولتمند تھا، بہترین خطیب، بلند پایہ شاعر، جہاں دیدہ، عمر رسیدہ، تجربہ کار اور ایسا سلیقہ مند کہ شاہان ایران ،افریقہ اور شام کے درباروں میں جاتا رہتا تھا اور وہاں اس کی عزت کی جاتی تھی ۔

ولید آنحضرت ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کی، آنحضرت ؐ نے اپنے مقصد کی وضاحت کی اور چند آیتیں قرآن پاک کی پڑھ کر سنائیں ۔

ولید آیتیں سُن کر ہکابکارہ گیا ۔ آنحضرتؐ کو تبلیغ سے منع تو کیا کرتا، خود گم ہوگیا ۔ خاموشی سے مجلس سے اٹھا اور جب مجلس قریش میں واپس پہنچا تو حالت عجیب تھی۔ لوگوں کو خیال ہوا ولید بہک گیا ۔ محمد کا ہوگیا مگر ولید باہمہ عقل اور دانش حیران تھا کہ جو کلام سنا ہے اس کے بارے میں اور خود محمد "رسول اللہ ؐ "کے بارے میں کیا فیصلہ کرے ۔ پورے غور و فکر اور موازنہ کے بعد ولید نے ارکان مجلس سے کہا :

محمد کو کاذب نہیں کہہ سکتے، اس کو کاہن بھی نہیں کہہ سکتے ۔ شعروسخن کا میں ماہر ہوں اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے۔ کاہنوں کی تک بندیوں کو بھی میں جانتا ہوں ۔ محمد جو

° ولیدبن مغیرہ کا آسان تعارف اب یہ ہے کہ اسلام کے مشہور اور کامیاب ترین جرنیل حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کے نامور فرزند تھے جو اس واقعہ سے تقریباً پندرہ سال بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

کلام پیش کرتے ہیں وہ ان سب سے بہت بلند ہے، اس کا کوئی جواب نہیں ہے اس کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ مجھ جیسا پختہ اور ٹھوس آدمی بھی چکرا گیا ۔

اصل سوال کے متعلق ولید نے رائے دی کہ محمد ﷺ کی شائستہ اور شیریں گفتگو اور اس کلام کی غیرمعمولی تاثیر کا توڑ یہی ہوسکتا ہے کہ پوری قوت سے پروپیگنڈہ کرو کہ

(۱) محمد ﷺ جادوگر ہے ۔ وہ ایسے منتر پڑھتا ہے کہ گھر گھر میں پھوٹ پڑ جاتی ہے ۔ لہذا اس کی بات نہ سنو۔

(۲) وہ دین سے پھر گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم سب، تمہارے باپ دادا، اور تمہارے وہ دیوتا جن کی پوجا کرتے ہو، یہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں ۔

(۳) تم یہ بھی کہہ سکتے ہوکہ محمدﷺ کا دماغ خراب ہوگیا ہے ۔

ولید کی رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ اور صرف طے ہی نہیں کیا بلکہ اس شدومد سے عمل بھی شروع کردیا کہ ابھی قبائل کے لوگ حج کے لئے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ محمد ﷺ کی بے دینی کا چرچا ان کی گلی کوچوں تک پہنچ گیا اور نہ صرف محمدﷺ بلکہ آپ کے خاندان ”آل ہاشم“ کے متعلق بھی نفرت کی لہر ان تمام قبائل میں دوڑ گئی جو حج کیلئے آنے والے تھے۔ ابولہب کے متعلق طے کیاگیا کہ وہ محمدﷺ کی نگرانی رکھیں گے اور جہاں وہ تقریر کرنا چاہیں

یا لوگوں سے گفتگو کریں وہ ان کو منتشر کردیں ۔

"ابولہب" آنحضرت ؐ کا سب سے بڑا چچا (تایا) تھا۔ مالدار اور با وجاہت بھی تھا ۔ عرب کے قاعدہ کے مطابق خاندان کا بڑا شخص خاندان کے ہر فرد کا ولی مانا جاتا تھا اور اس کو حق ہوتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے کے متعلق کوئی اعلان کردے ۔ قصاص وغیرہ کے قضیوں میں ایسے ولی کے قول کی خاص اہمیت ہوتی تھی ۔ اسی غرض سے اس کو اس خدمت کے لئے مقرر کیاگیا تھا کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کی حیثیت سے لوگوں کو بتائے کہ محمد ؐ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ اپنے خاندانی بزرگوں کو جہنمی بتاتا ہے اور دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے۔ وغیرہ ۔ ظاہر ہے کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کے قول سے زیادہ کس کی بات معتبر ہوسکتی ہے ۔

حج کے موقع پر انتظام کے متعدد شعبے خصوصاً سقایہ یعنی حاجیوں کیلئے پانی کا انتظام (جو سرزمین حجاز خصوصاً مکہ میں سب سے سخت کام تھا) آل ہاشم کے سپرد ہوتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابولہب کے علاوہ آپ کا پورا خاندان اگرچہ مسلمان نہیں ہوا تھا مگر آپ کا حامی تھا ۔ خواجہ ابوطالب ان میں پیش پیش تھے ۔ سرداران قریش کے پروپیگنڈے کے باعث جو نفرت خاندان ہاشم سے عرب میں پھیل گئی تھی، خواجہ ابو طالب کو اس کا اندازہ تھا ۔ انہیں خطرہ ہوا کہ حج کے موقع پر یہ نفرت

بغـــاوت کی شـــکل اختیـــار کـــرلے گی اور وہ ان خدمات سے محروم ہوجائیں گے جــو حج کے موقــع پر ان کے ســپرد ہوتی تھیں ۔ قبـائلی رقـابت اس فتنے کو اور ہوا دے سکتی تھی۔

لہذا خواجہ ابو طالب[1] نے تقریباً سو شعر کـا طویـل قصـیدہ لکھـا۔ جس میں خـانہ کعبہ ،حـرم شـــــریف کی عظمت و حـــــرمت، اس کے واجب الاحــترام ہونے کے متعلــق مســلمہ روایــات، پھــر خاندان ہاشم کی عظیم الشان خدمات کـا تـذکرہ کیا ۔ اس قصـیدہ میں آنحضـرتﷺ کی سـیرت پـر بھی روشــنی ڈالی کہ ان کے اخلاق واوصـاف کیـا ہیں اور قــریش کس طــرح ان کی تعظیم کــرتے رہے ہیں ۔ اسی قصـیدہ کـا وہ مشـہور شـعر ہے جو نعت شریف کے موقع پر عـام طـور سـے پڑھـا جاتا ہے ۔

وابیض[2] یستسقی الغمـــام بـــــــــــــــــوجھہ

ثمــــال الیتــــامیٰ عصــــــمة للا ر امل

آنحضرت ﷺ کے محامد بیان کرنے کے بعد یہ بھی

---

[1] ا بن ہشام نے اس پورے قصیدہ کو نقل کیـا ہے اور اس کی وجہ تصنیف یہی بیان کی ہے جو اوپر گــزری۔ ص ۱۶۶ تا ص ۱۷۱، ج۱

[2] یعنی محمد ﷺ کی ایک تعریف یہ ہے کہ ایسا روشن چہرہ جس کا واسطہ دیکر بادل سے بــارش مــانگی جــاتی ہے (یہ ایک واقعہ کی طرف اشـارہ ہے کہ بـارش نہیں ہوئی تھی تو قریش نے آپ سے دعا کرائی تھی اور بارش ہوگئی تھی) یــتیموں کی پنـــاہ ہیں ، بہ ســـہارا بیـــوہ عورتـــوں کی عصمتوں کے محافظ ۔

واضح کیاکہ اگرچہ وہ ایک نئے مذہب کی دعوت دے رہے ہیں مگر ابناءہاشم جو حجاج کی خدمت کرتے ہیں وہ ان کے مذہب کے حامی نہیں ہیں ۔ وہ بدستور اپنے قدیم مذہب پر قائم ہیں اور ان کے عقائد وہی ہیں جو سرداران قریش اور عام عرب کے عقائد ہیں ۔ وہ اسی طرح دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں ۔ بااین ہمہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ "محمد" کو مخالفین کے حوالہ کردیں ۔ خاندان ابوطالب اپنی جانیں قربان کردیگا مگر اپنی موجودگی میں محمد ﷺ کا بال بیکا نہیں ہونے دے گا۔

عرب شعر کے دلدادہ ہوتے تھے۔ شاعروں کے قصیدے جیسے ہی پڑھتے جاتے تھے، بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور پھر جگہ جگہ وہ نقل کئے جاتے تھے۔ اس وقت شعراءکے قصائد کو وہی طاقت حاصل تھی جو دور حاضر میں کسی مضبوط پریس کو حاصل ہے ۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب کا یہ قصیدہ تما م قبائل میں پھیل گیا اور اس طرح وہ فتنہ فرو ہوا جو بنو ہاشم کے خلاف کھڑا کیا جارہا تھا۔ مگر آنحضرت ﷺ کی دعوت کے متعلق اس کی وہی قوت باقی رہی بلکہ خواجہ ابوطالب کے قصیدہ نے اور تائید کردی کہ محمد ﷺ نئے مذہب کے داعی ہیں ۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب اور ان کے ساتھیوں کو تو اپنی خدمات کی انجام دہی میں کوئی نئی دشواری پیش نہیں آئی مگر آنحضرتﷺ کا تعاقب پوری طرح کیاگیا ۔

آنحضرت ﷺ جہاں تشریف لے جاتے عرب کا گورا چٹا[3] ایک باوجاہت سردار (ابولہب) ان کے پیچھے ہوتا ،جولوگوں کو ڈانٹتا رہتا کہ ان کی بات نہ سنو، یہ پاگل ہوگئے ہیں [1] (معاذ اللہ)

ہڑبونگ اور انتشار:

ابولہب کا یہ طریقہ انفرادی نہیں رہا بلکہ اجتماعی بن گیا۔ اور یہ طے کردیاگیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ جہاں بھی تقریرکریں یا قرآن پاک کی آیتیں سنائیں اتنا شور مچاؤ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اور محمد ﷺ زچ ہوکر رہ جائیں [2]۔ قریش مکہ کی شرارت پسندی کو داد دینی چاہئے کہ کئی سال تک یہ پروگرام چلاتے رہے۔

ناکہ بندی :

ابوذررضی اللہ عنہ قبیلہ غفار کے نمایاں شخص تھے۔ دل میں صداقت کی تڑپ رکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے دعوئٰ نبوت کا چرچا آپ تک پہنچا۔ حقیقت معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا ۔ چھوٹے بھائی (انیس) سے کہا : مکہ معظمہ جاؤ اور تحقیق کرکے آؤ ۔ انیس مکہ آئے، ملے جلے اور واپس جاکر رپورٹ دی ۔ ایک صاحب ہیں اچھی

---

[3] ابولہب کا رنگ سفید، سرخی رخساروں میں گھپی ہوئی، اس کے رخساروں کو شعلوں سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کا لقب ابولہب رکھاگیا تھا یعنی شعلوں والا ۔

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۴۵ ج ا وغیرہ

[2] قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حم سجدہ ۔ ۴۱)

باتیں بتاتے ہیں بری باتوں سے روکتے ہیں ۔

ابو ذر اس دوحرفی رپورٹ سے مطمئن نہیں ہوئے، خود سفر کا ارادہ کرلیا اور فوراً ہی تیار ہوکر چل دیئے ۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ مکہ میں آئے لیکن تحقیق کس سے کریں ؟ جہاں نام لینا بھی مصیبت کا سرلینا تھا ۔ لوگ مارنے اور پیٹنے کو تیار ہوجاتے تھے، وہاں راستہ کون بتاتا اور تعارف کون کراتا۔ کئی دن اس شش وپنج میں گذر گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو دیکھا کرتے تھے ایک روز ان کو دیکھ کر ٹھٹکے اتہ پتہ اور مکہ آنے کا سبب معلوم کیا اور جب مقصد معلوم ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ مگر اس طرح چلو کہ کسی کو معلوم نہ ہوکہ میرے ساتھ چل رہے ہو۔ میں کوئی اندیشہ محسوس کروں گا تو چپل ٹھیک کرنے کے بہانے دیوار سے لگ کر کھڑا ہوجاؤں گا تم آگے چلتے رہنا۔ غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی راز داری سے کام لیا، تب حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ منزل مقصود پر پہنچ سکے۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی نظر روئے انور پر پڑی دل نے تصدیق کی کہ گوہر مراد حاصل ہوگیا۔ آپ نے اسلام کا پیغام معلوم کیا اور بقول ابوذر رضی اللہ عنہ وہیں کہ وہیں ❸(فوراً) مسلمان ہوگئے ۔

زدوکوب اور مشق ستم :

ایمان کا نور تھا یا جرأت و ہمت کا فولاد جو

---

❸ اسلمت مکانی بخاری شریف س ۴۹۹

ابوذر ؓ کو حاصل ہوا ۔ واپس ہوکر حرم کعبہ میں پہنچے۔ قریش کے کئی سردار حرم میں موجود تھے۔ حضرت ابو ذر ؓ کی نظر ان فرعون منش سرداروں پر پڑی تو جوش آگیا۔ ایسی سیدھی راہ اور ایسی سچی بات۔ اور ان لوگوں نے اس کے ناکے بند کر رکھے ہیں اور یہ "محمد" مجسم صداقت و ہدایت ان کا کوئی نام تک زبان پر نہیں لاسکتا ۔ اس تصور نے جذبہ کی قوت حاصل کی۔ چنانچہ آپ نے اُن روساءکو خطاب کرکے فرمایا : یامعشر قریش۔ انی اشھدُ ان لاالٰہ الا اللّٰہ۔"

قریش کے سردار اس جرأت کو کب نظرانداز کرسکتے تھے، آوازدی : قوموالیٰ ھذا الصابی۔ اٹھ کھڑے ہو اس بے دین کی طرف (مارو اس بے دین کو)۔ سب طرف سے لوگ حضرت ابوذر ؓ پر ٹوٹ پڑے اور جاں بلب کردیا ۔ حضرت عباس جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے وہاں موجود تھے۔ انہیں خطرہ ہوا کہ ابوذرؓ کی جان جاتی رہے گی وہ ان کے اوپر اوندھے پڑگئے۔ اور پکارکر کہا:

"یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے۔ اس کے قبیلے والوں نے اگر تمہارا راستہ بند کردیا تو بھوکے مرجاؤ گے۔ غلہ کا ایک دانہ تم تک نہ پہنچ سکے گا ۔"

غلہ کا نام سن کر لوگوں نے ان کو چھوڑا۔

اگلے روز پھر یہی ہوا ۔ حضرت ابوذر ؓ نے اسلام کا نعرہ بلند کیا اور قریش کے نوجوانوں

نے ان کو پیٹنا شروع کیا ، تب بھی حضرت عباس ہی کسی طرح وہاں پہنچ گئے اور یہی کہہ کر ان کو بچایا ۔[1]

اسطرح کے واقعات اسلام لانے والوں کے ساتھ مسلسل ہوتے رہتے تھے ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کئی بار اس طرح تختہ مشق بن چکے تھے مگر مارنے والوں میں کوئی بچانے والا بھی کھڑا ہوجاتا تھا جس سے جان بچ جاتی تھی، لیکن ایسا بھی ہوا کہ کوئی بچانے والا نہیں پہنچ سکا توجان بھی جاتی رہی ۔

حارث بن ابی ھالہ، جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لڑکے اور آنحضرتﷺ کے پروردہ تھے، ایک مرتبہ آنحضرتﷺ کو چھڑانے آئے، لوگوں نے آپ کو تو چھوڑ دیا مگران کو اتنا مارا کہ شہید ہوگئے ۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے حرم مکہ کی وہ زمین رنگین ہوئی جہاں اللہ کے بندے طواف کیا کرتے ہیں ۔[2]

حضرت عمار رضی اللہ عنہ:مشہور صحابی ہیں ان کے والد کانام یاسر اور والدہ کا نام سمیہ رضی اللہ عنہا تھا، ابوجہل نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے اندام نہانی میں برچھی ماری وہ غریب شہید ہوگئیں ۔ یہ پہلی خاتون تھیں جو راہ خدا میں شہید ہوئیں ۔ رضی اللہ عنہا [1]

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو جلتی ہوئی زمین پر

---

[1] بخاری شریف ص ۴۹۹ ،

[2] اول من قتل فی سبیل اللہ تحت الرکن الیمانی الاصابہ (ص ۳۰۶ ج ا)

[1] اول شہیدة فی الاسلام، الاستیعاب س ۶۳۵

لٹاتے اور اتنا مارتے کہ بے ہوش ہوجاتے تھے، مگر زندگی تھی باقی رہ گئے ۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ: امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہوجاتا تو ان کو تپتے ہوئے بالو پر لٹایا جاتا اور پتھر ان کے سینے پر رکھ دیا جاتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں ۔اور ان سے کہاجاتا کہ اسلام سے باز آئیں ، مگر ان کی زبان سے "احد" ہی نکلتا یعنی معبود ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے ۔

جب دھوپ میں تیزی نہ رہتی تو گلے میں رسی بندھوا کر لڑکوں کے حوالے کردیا جاتا کہ مکہ کے اُس سرے سے اس سرے تک گھسیٹتے پھریں ۔

حضرت ابو فکیھہ رضی اللہ عنہ ۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ صفوان ان کو بھی یہی سزا دلواتا تھا کہ ان کو گھسیٹتے ہوئے تپتے ہوئے ریت پر ڈال دیاجاتا اور سینے پر پتھر رکھ دیا جاتا۔ ایک روز اتنا بھاری پتھر سینے پر رکھ دیا گیا کہ ان کی زبان نکل آئی ۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: جو تیسرے خلیفہ ہوئے، بہت اونچے خاندان کے باحیثیت رئیس تھے ۔ جب مسلمان ہوئے تو دوسروں نے نہیں خود ان کے چچا نے ان کو رسی سے باندھ کرمارا ۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ: اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے۔

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ: مسلمان

ہوئے تو ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں ۔ ایک روز دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹادیا گیا ۔ ایک شخص چھاتی پر پیررکھ کر کھڑا ہوگیا کہ کروٹ نہ لے سکیں ۔ یہاں تک کہ کوئلے خون اور چربی سے تر ہوکر ٹھنڈے ہوگئے ۔ مدتوں کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورخلافت میں انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور پیٹھ کھول کر دکھائی جو برص کے داغ کی طرح بالکل سفید تھی ۔❷

الغرض اس طرح کے مظلوموں کی فہرست بہت طویل ہے اور مظالم کی داستان اس سے بھی زیادہ طویل ۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح کے مظالم جو سوچے سمجھے منصوبہ کے بموجب قریش کی طرف سے کئے جارہے تھے انہوں نے مکہ کی پوری فضا کو اس درجہ دہشت زدہ اور مرعوب کردیا تھا کہ کھلے بدوں اعلان حق تو درکنار لوگوں کو آنحضرت ﷺ کا نام نامی زبان پر لانے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی ۔ حتیٰ کہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ بعض روایتوں کے بموجب ایک ماہ تک حرم شریف میں پڑے رہے ۔ صرف زمزم پر گزارا رہا ۔ مگر آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچ سکے۔ کسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوا تو بڑی راز داری کے ساتھ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس لے گئے ۔ (جس کی تفصیل اوپر گزری ہے)

اس طرح کے بے پناہ مظالم نے آنحضرت ﷺ کو مجبور کردیا کہ کسی خفیہ مقام پر قیام

---

❷ یہ تمام واقعات ان حضرات کے حالات میں الاستیعاب اور الاصابہ وغیرہ میں درج ہیں ۔

فرمائیں ۔ چنانچہ اک مدت تک دار بنی ارقم میں آپ اور آپ کے ساتھی جن کی تعداد تیس کے قریب تھی پناہ گزیں رہے۔ نہایت عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام مظالم کے مقابلہ میں رحمۃ اللعالمین کی زبان مبارک اگر متحرک ہوتی تو صرف دعائے خیر کیلئے۔ یہی حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو انگاروں پر لٹایا گیا تھا انہوں نے ایک روز درخواست کی کہ رسول خدا ﷺ ان ظالموں کے لئے بددعا فرمادیں ۔ آنحضرت ﷺ خباب رضی اللہ عنہ کے الفاظ سنے سیدھے بیٹھ گئے ، روئے انور سرخ ہوگیا فرمایا: پہلی امتوں میں یہاں تک ظلم ہوئے ہیں کہ لوہے کے کنگھے سے ہڈیوں اور پٹھوں تک گوشت کھرچ دیا جاتا تھا۔ کسی داعی حق کے سرپر آرہ رکھ کر بیچ سے چیردیا گیا، مگران حضرات کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی۔ پھرفرمایا : یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل فرمائے گا ، یہاں تک ایک مسافر تنہا صفا یمن سے حضر موت تک پہنچ جایا کرے گا، راستہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہیں ہوگا ، زیادہ سے زیادہ یہ کہ بھیڑیئے کا خطرہ ہوگا جو اس کے گلہ پر حملہ کرسکے گا۔[۵]

مقصد :

حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان کے والد اور والدہ تینوں کو طرح طرح ستایا جارہا تھا۔ آنحضرت ﷺ

---

۵ بخاری شریف ص ۵۴۳

اس طرف سے گذرے، ان کو مبتلا عذاب دیکھ کر فرمایا: صبراً یا آل یاسر ان موعدکم الجنة۔[2] آل یاسر ! صبر کرو تم سے جنت کا وعدہ ہے۔ یعنی اس انقلابی پارٹی کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس کے مجاہدین کی نظر صرف آخرت پر ہوگی ، ان کی ہر قربانی اللہ کے لئے ہوگی ، غلبہ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد یقیناً دنیاوی مفادات بھی حاصل ہونگے ، مگر وہ اللہ تعالیٰ کا فضل وانعام مانا جائیگا مجاہد کا نصب العین نہیں ہوگا۔ قرآن حکیم نے اعلان فرمادیا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔[3] یہ عالم آخرت ہم انہیں لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا، اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کے لئے ہوتا ہے ۔

ہجرت حبشہ

قریش اورترقی پذیر قبائل عرب کے پاس نہ فوج تھی نہ پولیس ، البتہ معاہدات کا سلسلہ ایسا تھا جو فوج اور پولیس کا کام دیتا تھا ۔

معاہدہ ایک حصار ہوتا تھا جو جان کا بھی محافظ ہوتا تھا اور مال کابھی ، اور ان معاہدات کے ذریعہ طاقت کا بھی توازن قائم رہتا تھا ، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو اسی چیز نے بچایا تھا کہ قبیلہ غفار (جس سے قریش کا معاہدہ تھا) اگر بگڑ گیا تو قریش کا اس

---

[2] الاستیعاب ص ۶۳۲نمبر ۲۷۹۳۔

[3] سورہ قصص ۲۸ آیت ۸۳

طرف سے گزرنا اور غلے برآمد کرنا ناممکن ہوجائیگا۔ ابوبکر صدیق،عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم) خود اپنے طور پر مختلف قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے۔ ابتداءمیں آنحضرت ﷺ براہ راست کسی قبیلے سے معاہدہ کئے ہوئے نہیں تھے۔ مگر ان کی حفاظت کی ذمہ داری خواجہ ابو طالب نے لے رکھی تھی۔ خواجہ ابو طالب دوسرے قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے، اس بناءپر آنحضرت ﷺ جس طرح خواجہ ابی طالب کی پناہ میں تھے اور خواجہ ابو طالب آپ کی پناہ کے ذمہ دار تھے اسی طرح وہ تمام قبائل بھی آنحضرت ﷺ کی حفاظت کے ذمہ دار تھے جو ابوطالب سے معاہدے کئے ہوئے تھے۔ مگر اسلام سے مشرف ہونے والوں میں بڑی تعداد وہ تھی جن کے کسی سے خود اپنے معاہدے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے قبیلوں کے شیوخ اور سربراہ نہیں تھے، سربراہ دوسرے تھے یہ ان کے تابع تھے ۔ شیوخ اور سربراہوں کے معاہدات کے باعث یہ فائدہ تو تھاکہ غیرقبیلے کے لوگ ان کو مظالم کا نشانہ نہیں بناسکتے تھے۔ مگر خود قبیلے کے لوگوں کی مخالفت سوہان روح تھی۔ یہ مسلمان ہوگئے تھے مگر جس مقصد سے مسلمان ہوئے تھے وہ حاصل نہیں تھا۔ یعنی یہ لوگ خدا واحد کی عبادت نہیں کرسکتے تھے۔ چھپ کر قرآن شریف پڑھتے ۔ اگر راز فاش ہوجاتا تو طرح طرح کے ظلم سہنے پڑتے ۔ آنحضرت ﷺ اذیتیں اور تکلیفیں سہ رہے تھے۔ مگر آپ کو اپنی تکلیف

کا احساس نہیں تھا۔ البتہ ان ساتھیوں کی اذیت کا احساس آپ کو بے چین رکھتا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ حبش کا بادشاہ نیک نفس عیسائی ہے۔ اس کی مملکت میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لہٰذا آپ نے مشورہ دیا کہ جوجاسکتے ہوں وہ حبش چلے جائیں ۔

اس مشورے پر عمل ہوا ۔ پہلے پندرہ صحابہ کا قافلہ روانہ ہوا۔ گیارہ مرد تھے اور چار عورتیں ۔ یہ قافلہ ساحل سمندر پر پہنچا ۔ ایک جہاز روانہ ہونے والا تھا، اس میں نہایت سستے محصول پر جگہ مل گئی قریش کو اس قافلے کی روانگی کا علم ہوا تو ایک جماعت ان کو پکڑنے کے لئے دوڑادی، مگر جب وہ ساحل سمندر پر پہنچی تو جہاز روانہ ہوچکا تھا ۔

ان حضرات کو وہاں اطمینان میسر آیا تو پھر اور مسلمانوں نے بھی یہ راستہ اختیار کیا ۔ مکہ معظمہ سے خفیہ طور سے اکا دکا روانہ ہوکر پہلے ساحل پر جمع ہوگئے اور وہاں سے حبش روانہ ہوگئے۔ اس دوسرے قافلے میں تقریباً سترافراد تھے ۔

قریش کے لئے یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ اتنے مسلمان وہاں جمع ہوگئے ۔ انہوں نے بہت کچھ ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ بادشاہ حبش کے پاس سفارت بھیجی کہ یہ لوگ بھاگ کر چلے آئے ہیں ان کو حوالے کردیا جائے ۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو طلب کرکے ان کا مقصد معلوم کیا ۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے

مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی وہ تمام مورخین نے نقل کی ہے اس کا اردو پیرہن یہ ہے :

بادشاہ علیجاہ !

یہ درست ہے کہ ہماری قوم بت پرست تھی، جاہل تھی، اس کو حلال حرام کی تمیز نہیں ، مردار کھاجاتی تھی، بدکاریاں کرتی تھی ہمسایوں کو ستاتی تھی، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، لڑکیوں کو زندہ درگور کردیاجاتا تھا ۔ جو برائی ہوسکتی ہے وہ سب ہمارے معاشرے (سماج) میں موجود تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا، ہم میں ایک شخص پیدا ہوا ۔ عمر کے چالیس سال اس نے ہمارے بیچ میں رہ کر اس طرح گزارے کہ پوری قوم اس کی شرافت کی قائل ہوگئی ۔ اسکی صداقت اور سچائی سے یہاں تک متاثر ہوئی کہ اس کو الصادق اور الامین کہنے لگی ۔ اس نے بتایا کہ خدا نے اس کو نبی بناکر بھیجا ہے اور خدا کا حکم یہ ہے کہ صرف خدا واحد کی عبادت کرو، بت پرستی چھوڑ دو، کمزوروں کی مدد کرو، غریبوں پر رحم کرو ،ایک دوسرے سے محبت کرو، آپس میں شفقت اور مہربانی سے کام لو، سچائی اختیار کرو، بری باتیں چھوڑ دو، نیک اور دیانتدار بن جاؤ ۔

اے بادشاہ ! ہمیں یہ باتیں اچھی معلوم

ہوئیں ہم نے اس کا دامن سنبھال لیا ہے اور اس کے کہنے پر عمل شروع کردیا ہے ۔

سفارت قریش کے ارکان نے یہ دیکھا کہ بادشاہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے متاثر ہورہا ہے تو انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیجئے ، یہ کچھ اور کہتے ہیں اور عیسائیوں کی تردید کرتے ہیں ۔

بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم کا دوسرا پورا رکوع پڑھ کر سنادیا، جس میں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی بیان کرکے بتایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے معجزے عطا فرمائے تھے ۔ اور پہلا معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے گہوارہ ہی میں بولنا شروع کردیا تھا ۔

بادشاہ قرآن پاک کی آیتوں اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے یہاں تک متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ پادریوں کو خطاب کرکے کہاکہ میرا یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت اس سے ایک تنکے کی برابر بھی زیادہ نہیں ہے جو انہوں نے قرآن شریف کے حوالہ سے بیان کی ہے ۔ پھر قریش کے سفیروں سے کہہ دیا کہ یہ لوگ آپ کے غلام نہیں ہیں ، آپ کے مقروض نہیں ہیں ، پھر ان کو آپ کے حوالہ

کیوں کیا جائے ؟ مسلمانوں سے کہاکہ وہ اس کی مملکت میں اطمینان سے رہیں ۔❶

مسلمان وہاں پر رہے۔ ایک مرتبہ ایک غنیم کا حملہ ہوا تو مسلمانوں نے شاہی فوج کی مدد بھی کی۔❷

قریش کا تاثر :

قریش کو اس سفارت کی ناکامی کا علم ہوا تو مسلمانوں کے خلاف ان کا غیض و غضب اور بڑھ گیا اور خواجہ ابو طالب اور آل ہاشم پر پورا زور ڈالنا شروع کردیا کہ محمد ﷺ کی ذمہ داری سے دست کش ہوجائیں ۔ چنانچہ روساءقریش کا ایک وفد خواجہ ابو طالب کے پاس پہنچا اور بہت زور ڈالا کہ آنحضرتﷺ کو منع کردیں ، ورنہ ان کو ہمارے حوالہ کردیں ۔ مجبور ہوکر ابوطالب نے آنحضرت ﷺ سے گفتگو کی ۔ آپ نے فرمایا:

> ”چچا جان ! آپ کی شفقت و محبت کا شکریہ! آپ یقیناً معذور ہیں ۔ آپ میری امداد سے دست کش ہوجائیے ۔ مگر مجھے میرے رب نے جس مقام پر کھڑا کردیا ہے۔ میں اس سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹ سکتا ۔“

خواجہ ابو طالب نے یہ پختگی دیکھی تو قریش

---

❶ یہ بادشاہ مسلمان ہوگیا تھا ۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اسی روز اسکے انتقال کی خبر دیدی اور غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ۔

❷ المسبوط للسرخی ص ۹۸ ج ۱۰ باب نکاح اہل الحرب و دخول التجار الیہم بامانہ

کو جواب دیدیا کہ وہ محمد کی حمایت نہیں چھوڑ سکتے اور آنحضرت ﷺ کو اجازت دی کہ وہ اپنا کام کرتے رہیں ۔ لیکن آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے لئے یہ نئی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ ایک سوکے قریب مسلمان حبشہ چلے گئے تو اب صرف تیس چالیس مسلمان رہ گئے جن کے لئے مکہ کی غضبناک فضا میں زندگی اور بھی دوبھر ہوگئی تھی۔ ان میں کافی تعداد غلاموں کی تھی ۔ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کردیا تھا، لیکن آزادی کے بعد بھی وہ بے پناہ تھے ۔ مسلمان ان کی پناہ ہوسکتے تھے مگر وہ خود چھپ چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھے ۔

حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا:

مسلمانوں کی تعداد سوسے زیادہ ہوگئی تھی۔ ان میں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور شیرخدا حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے جنگجو بہادر بھی تھے، جنہوں نے مستقبل میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے اور غزوات میں بہادری کے بے نظیر جوہر دکھائے۔ مگر یہ حضرات اس وقت ایسے نہیں تھے جن کی مکہ میں دھاک ہو اور جن سے پورا شہر مرعوب رہتا ہو ۔ یہ بات صرف دو[1] کو حاصل تھی : عمر بن الخطاب

---

[1] نام دونوں کا عمر ، ایک عمر بن الخطاب دوسرے عمر بن ہشام جو ابوالحکم کی کنیت سے مشہور تھا پھر ابوجہل کے نام سے مشہور ہوا ۔

اور ان کے ماموں ابوجہل بن ہشام کو۔ مگر یہ
دونوں اسلام کے مقابلے میں بہت سخت تھے ۔
آنحضرت ﷺ دعافرمایا کرتے تھے کہ خدا وند ان
دونوں میں جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے
اسلام کو تقویت فرما ۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ جرأت ہی
تھی کہ ایک روز طے کرلیا کہ محمد ﷺ کا قصہ
تمام کرکے اس خلفشار کا خاتمہ کردوں جس سے
قریش کی زندگی تلخ ہوگئی ہے اور آئے دن ایک
ہنگامہ برپا رہتا ہے ۔

عمر بن الخطاب نے تلوار ہاتھ میں لے لی اور
محمد ﷺ کی تلاش میں نکلے ۔ راستے میں ایک
صاحب نعیم ❷بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو
دیکھا ۔ تیور چڑھے ہوئے تھے دریافت کیا : ابن
الخطاب کیا ارادہ ہے ؟

عمر بن الخطاب :اُس فتنے کو ختم کرنے
جارہا ہوں جو محمد نے برپا کردیا ہے(ﷺ)

نعیم بن عبداللہ : خاندان ہاشم اور جو ان کے
حلیف ہیں ان سے کیسے نمٹو گے ؟ اور دیکھو ابن
الخطاب ! محمد کو ختم کرنے سے پہلے اپنے گھر
کی خبرلو ۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی
سعید بن زید مسلمان ہوچکے ہیں ۔

---

❷ نعیم بن عبداللہ النحام، مسلمان ہوچکے تھے۔ مگر اپنے
اسلام کا اظہار نہیں کیاتھا ۔ النحام، نحمہ سے ماخوذ ہے۔
نحمہ کے معنیٰ ہیں آہٹ یا کھنکار کی آواز ۔ آنحضرت ﷺ نے
ان کے متعلق فرمایا تھا : سمعت نحسته فی الجنة میں نے
جنت میں ان کانحمہ سنا ہے ۔ اسی بشارت کی بنا پر ان
کا خطاب نحام ہوگیا ۔ (سیرت حلبیہ ص ۳۴۹ ج ۱)

عمر رضی اللہ عنہ ان طعن آمیز، اشتعال انگیز فقروں کو کب برداشت کرسکتے تھے وہ فوراً پلٹے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تلاش چھوڑ کر بہن کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ قرآن شریف پڑھارہے تھے۔ جیسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی، ہمشیرہ صاحبہ نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو اندر کردیا مگر تلاوت کی کچھ بھنک عمر کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ عمر جیسے ہی مکان میں داخل ہوئے پوچھا : تم کیا پڑھ رہے تھے؟ بہن بہنوئی نے بات کو چھپانا چاہا ، کچھ خاموش رہے تو عمر رضی اللہ عنہ نے اسی تیزی میں کہا: میں نے سنا ہے تم بے دین ہوگئے ہو یہ کہہ کر بہنوئی پر ہاتھ اٹھایا ، بہن اپنے شوہر کو بچانے کے لئے آگے بڑھیں تو ان کے سر پر بھی اتنی زور سے مارا کہ خون بہنے لگا ، اب بہن کو جوش آگیا ، فرمایا : عمر رضی اللہ عنہ جو چاہو کرلو، ہم مسلمان ہوچکے ہیں اور ہم قرآن شریف پڑھ رہے تھے ۔

بہن کے سرسے خون بہتا ہوا دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ پسیجے ، غصہ ٹھنڈا ہوا تو فرمایا : مجھے دکھاؤ کیا پڑھ رہے تھے ۔

بہن نے فرمایا : تم دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے غسل کرو، تم کا فر ہو، ناپاک ہو، قرآن کو نہیں چھوسکتے ۔

اب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا غصہ ختم ہوچکا تھا اور اصل حقیقت معلوم کرنے کا شوق اتنا

بڑھ چکا تھا کہ بہن کے توہین آمیز کلام کو
برداشت کیا اور غسل کرکے کلام اللہ کے اوراق
پڑھنے شروع کئے۔
سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ ہُوَ الْعَزِیْزُ
الْحَکِیْمُ ۱﴿ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یُحْیٖ وَ
یُمِیْتُ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۲﴿ ہُوَ الْاَوَّلُ وَ
الْاٰخِرُ وَ الظَّاہِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۳﴿
ہُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ
اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا
یَخْرُجُ مِنْہَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْہَا ؕ وَ
ہُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۴﴿
لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ
۵﴿ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّہَارِ وَ یُوْلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیْلِ ؕ
وَ ہُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۶﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ
وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
مِنْکُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَہُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ۷﴿ (سورہ حدید ۱ تا ۷)
ترجمہ : آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ
کی پاکی بیان کرتا ہے (کہ وہ ہر ایک نقص سے
مبرا ہے)۔ وہ زبردست حکمت والا ہے ۔ آسمانوں
اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے ۔ (مستحق
بادشاہت وہی ہے) وہی زندگی بخشتا ہے۔ اور
موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ پہلے
ہے۔ وہی پیچھے ۔ وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی
(باطن)۔ اور وہ ہرچیز کا پورا علم رکھنے والا ہے
۔ وہ ایسا ہے کہ اس نے پیدا کیا آسمانوں اور
زمین کو چھ روز (دور) میں ۔ پھر وہ عرش پر
رونق افروز ہوا (پوری کائنات کو اپنے اقتدار میں

لے لیا) ہر چیز کا اس کو علم ہے ۔ وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور جو زمین سے نکلتی ہے ۔ جو آسمان سے اترتی ہے جو آسمان پر چڑھتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے تمام اعمال دیکھتا ہے ۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے اور تمام باتوں کا مرجع وہی اللہ کی ذات ہے۔ وہ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں ۔ وہ دل کی باتوں کو پوری طرح جانتا ہے ۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر ۔ اور اس مال میں سے خرچ کرو جس پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور مال خرچ کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

اوپر کی آیتوں میں اللہ کی ذات اور صفات کا ذکر ہے ۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کرتے تھے : میں یہ آیتیں پڑھ رہا تھا اور جب اللہ کا نام آتا تھا دل کانپ جاتا تھا یہاں تک کہ جب ساتویں آیت پر پہنچا "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر" تو بے اختیار زبان سے نکلا "اشہد ان لاالہ الاّ اللّٰہ و اشہدان محمدا رسول اللّٰہ"

حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو اندر چھپادیا گیا تھا انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے کلمہ شہادت سنا تو خوش ہوتے ہوئے باہر آئے اور فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ بشارت ہو آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ خدا وند!! ابوجہل اور عمر میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام

کی تقویت فرمائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بشارت سن کر فوراً ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آنحضرت ﷺ دار بنی ارقم میں کوہ صفا کے دامن میں پناہ گزین تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور کچھ اور صاحبان حاضر خدمت تھے۔ ان صاحبان نے عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا ، تلوار ہاتھ میں لئے آرہے ہیں ، کچھ خیال پیدا ہوا مگر یہ بھی سوچ لیا کہ بھرپور جواب دیا جائے گا ۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ پہنچے تو انداز دوسراتھا ۔ آگے بڑھے تو رحمت عالم ﷺ نے کھڑے ہوکر استقبال کیا اور چادر یا کرتے کا کنارہ پکڑ کر فرمایا : عمر کیسے آئے ؟ پھر فرمایا : عمر بازنہ آؤ گے ؟ کیا خدا کے قہر[1] کا انتظار کررہے ہو ؟

عمر فاروق رضی اللہ عنہ: حضرت باز آچکا ہوں ۔ اشہد ان لاالٰہ الااللّٰہ واشہدان محمدًا عبدہ ورسولہ ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کی اتنی مسرت ہوئی کہ خود آنحضرت ﷺ نے بھی زور سے تکبیر کہی اور آپ کے ساتھیوں نے بھی زور سے تکبیر کہی۔ یہاں تک کہ یہ دامن کوہ نعرہ تکبیر سے گونج اٹھا ۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہوجانے سے

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۸۱ ج ۳

[2] ماخوذ ازالبدایہ والنہایہ ص ۷۹ تا ص ۸۲ ج ۳، السیرۃ الحلبیہ ص ۳۴۹ تا ص ۴۵۳ و تاریخ الخلفاء

اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔ اب تک یہ موقع نہیں ملتا تھا کہ مسلمان حرم کعبہ میں نماز پڑھ سکیں ۔ مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو پہلے سرداران قریش میں سے ہر ایک کی ڈوڑھی پر پہنچ کر ہر ایک کو آگاہ کیا کہ عمر مسلمان ہوگیا ہے ۔ اس کے بعد تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر حرم شریف میں داخل ہوئے اور کھلے بندوں نماز پڑھی۔ لیکن قریش نے سب کی پوری طرح تواضع کی۔ خصوصاً حضرت عمر فاروق ہر ایک کا نشانہ بنے ۔❸

کافی مارپیٹ کے بعد کسی طرح یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ مگر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہوجانا ایسا حادثہ نہیں تھا جس پر قریش آسانی سے صبر کرلیتے ۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی دوبھر کردی ۔ حتیٰ کہ وہ بھی مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے ۔ لیکن عرب کے مشہور اور باہیبت قبیلہ بنی سہم سے ان کا معاہدہ تھا یہ معاہدہ اس وقت کام آیا ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے "عمر فاروق رضی اللہ عنہ مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ باہر میدان میں اتنا ہجوم تھا کہ پوری وادی آدمیوں سے پٹی ہوئی تھی، اور یہ شور تھا کہ عمر بے دین ہوگیا

---

❸ ماخوذ از تاریخ الخلفاءجلال الدین السیوطی والبدایہ والنہایہ ص ۷۲تا ۷۹ج ۳ والسیرة الحلبیہ ص ۳۴۹ تا ص ۳۸۲ ج ۱

ہے ۔ میں مکان کی چھت پر کھڑا ہوا یہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ میں پریشان تھاکہ کیا ہوگا۔ دفعةً ایک صاحب نمودار ہوئے۔ ریشمی کفوں دار قمیض پہنے ہوئے، اس کے اوپر ریشمی قبا اور شیوخ عرب کے قاعدے کے بموجب ایک بڑھیا چادر اوڑھے ہوئے وہ اندر مکان میں پہنچے ۔ والد صاحب سے دریافت کیا ۔ کیا واقعہ ہے ؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا : مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں ۔ جرم یہ ہے کہ مسلمان ہوگیا ہوں ۔ اس سردار نے کہا : ہرگز نہیں ۔ یہ کچھ نہیں کرسکتے۔ میں آپ کوپناہ دیتاہوں ۔ یہ کہہ کر یہ سردار باہر آیا اور اعلان کردیا کہ عمر کو میں نے پناہ دیدی ہے ۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جیسے ہی اس سردارنے یہ اعلان کیا وہ تمام مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا : یہ صاحب کون ہیں ۔ جواب دیا قبیلہ بنی سہم کا شیخ و رئیس عاص بن وائل سہمی ہے[1]

باایں ہمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھی اور بقول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہ قوت حاصل ہوئی جو پہلے نہیں تھی۔[2] ہم کھلے بندوں حرم کعبہ میں پہنچے، طواف کیا، نماز پڑھی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا اسلام کی فتح تھی ۔ ان کی ہجرت نصرت اور ان کی

---

[1] بخاری شریف ص ۵۴۵

[2] بخاری شریف ص ۵۲۰

شعب ابی طالب میں پناہ

قریش کی طرف سے قومی بائیکاٹ

پے درپے ناکامیوں نے قریش کو اور زیادہ مشتعل کردیا ۔ کھلم کھلا قتل کرنے میں قبائلی جنگ چھڑجانے کا خطرہ تھا۔ لیکن خفیہ طور پر قتل کرنے میں پہلے ثبوت کی ضرورت تھی، جس کا مہیا کرنا بنو ہاشم کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ خفیہ طور پر جان جہاں محمد رسول اللہ ﷺ کی جان لینے کی سازش ہونے لگی ۔ خواجہ ابو طالب کے چوکنے دماغ نے اس کو بھانپا ۔ انہیں صرف محمد ﷺ کے متعلق ہی نہیں بلکہ خاندان ہاشم کے اور لوگوں کے متعلق بھی خطرہ ہوا ۔ مثلاً خواجہ ابوطالب کے بڑے صاحبزادے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اگرچہ ہجرت کرکے حبش چلے گئے تھے لیکن چھوٹے صاحبزادے حضرت علی رضی اللہ عنہ یہیں تھے جو ہردم آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے ۔ خواجہ ابو طالب نے خاندان کے لوگوں سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ شہر کے خطرناک ماحول سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پناہ لی جائے ۔

پہاڑیوں کے بیچ میں ایک مقام “خیف بنی کنانہ” تھا۔ یہ بنو ہاشم کا موروثی رقبہ تھا ۔ طے یہ ہوا کہ وہاں جاکر قیام کیا جائے ۔ چنانچہ پورا خاندان (جس کے بہت سے افراد ابھی

---

❸ البدایہ والنہایہ ص ۷۹ ج ۳

مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے) اس مقام پر چلاگیا، جس کا دوسرا نام شعب ابی طالب تھا ۔ صرف ابو لہب اور اس کا گھرانا مکہ میں رہ گیا جو اپنے خاندان کے خلاف قریش کا سرگرم حامی تھا ۔ ابو طالب یہاں پہنچ کر بھی اپنے بھتیجے کی نگرانی راتوں کیا کرتے تھے ۔ ان کے سونے کی جگہ بھی بدلتے رہتے تھے ۔ قریش کے سرداروں نے اس کا جواب یہ دیا کہ تمام مخالف گروپوں کو ملاکر ان سب کا مقاطعہ کردیا، جو خواجہ ابوطالب کے ساتھ اس گھاٹی میں پناہ گزیں ہوئے تھے ۔ قریش کے ساتھ قبیلہ بنی کنانہ بھی اس معاہدہ میں شریک ہوا[1] ۔ مقاطعہ صرف رشتہ ناتہ کا نہیں تھا بلکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی بند کردیں ۔ ایک عہد نامہ لکھاگیا کہ ان کے ساتھ نہ نکاح بیاہ کیا جائیگا نہ خریدوفروخت اور کوشش کی جائے گی کہ مکہ سے باہر بھی کہیں سے یہ لوگ کچھ نہ خرید سکیں ۔ بیوپاریوں کو آمادہ کیاگیا کہ مکہ کے راستوں کی نگرانی رکھیں اور باہر سے آنے والی جنس کو مکہ میں پہنچنے سے پہلے ہی خریدلیا کریں ۔

سرداران قریش کے اس معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یہ عہدنامہ قومی حفاظت خانہ (خانہ کعبہ کے خزانہ) میں محفوظ کردیا گیا ۔[2]

نبوت کے ساتویں سالہ محرم کی پہلی تاریخ

---

[1] بخاری شریف ص ۴۳۰

[2] البدایہ والنہایہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ عن الزہری ص ۸۴ ج ۳

سے یہ مقاطعہ شروع ہوا تھا۔[3] جو تقریباً تین سال تک رہا ۔ اس عرصہ میں درختوں کے پتے اور جڑیں کھاکر زندگی گزارنی پڑی ۔ بچے بلبلاتے تھے مگر ان کو دودھ میسر نہیں آتا تھا ۔ بکریاں ختم ہوگئی تھیں اور پے درپے فاقوں سے ماؤں کے دودھ خشک ہوگئے تھے ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے رفقاءاگرچہ بنو ہاشم نہیں تھے مگروہ ان کے ساتھ تھے تو مقاطعہ ان سے بھی اتنا ہی سخت تھا۔[1]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا چمڑا ہاتھ آگیا۔ میں نے اس کو پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی ملاکر کھایا۔[2]

مکہ میں جو رشتہ دار تھے ان میں وہ بھی تھے جن کو اس حالت پر ترس آتا تھا ۔ مگر پابندیاں ایسی سخت تھیں کہ کوئی کچھ امداد نہیں کرسکتا تھا ۔

اس معاہدہ کی کوئی مدت نہیں تھی۔ اس کی انتہا یہ تھی کہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ کردیں ۔[3]

تین سال پورے ہونے لگے تو یک طرفہ متواتر ظلم و ستم کچھ اہل قرابت کے دلوں میں نرمی

---

[3] ابن سعد ص ۱۴۰ ج ۱

[1] سیرۃ ابن اسحاق بحوالہ ازالہ الخفاءص ۱۰ ج ۲

[2] روض الانف بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱

[3] موسیٰ بن عقبہ بحوالہ زہری ۔ البدایہ والنہایہ ص ۸۴ ج ۳

پیدا کی اور یہ بحث شروع ہوئی کہ معاہدہ کی پابندی کب تک کی جائے ۔ لیکن پلہ ان کا بھاری تھا جن کے سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر بھرے ہوئے تھے۔ دفعۃً ایک قدرتی حل سامنے آگیا ۔

آنحضرت ﷺ نے چچا ابوطالب کو خبردی کہ کیڑوں نے معاہدہ کے تمام حرف چاٹ لئے ہیں ۔ صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے ۔ خواجہ ابوطالب نے یہ الہامی خبر سنی تو قریش کے سرداروں کے پاس پہنچے کہ آج ہمارا تمہارا معاملہ طے ہے ۔ محمد نے یہ خبردی ہے اگر یہ خبر جھوٹی ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور اگر سچی ہے تو جب معاہدہ ہی نہیں رہا تو اس کی پابندی کیسی ۔

سرداران قریش نے یہ فیصلہ منظور کیا ۔ ان کو یقین تھا کہ جیت ہماری ہوگی ۔ مگر جب خزانہ کھول کر دستاویز نکالی گئی تو دیکھا "الصادق الامین" کی خبر حرف بحرف صحیح ہے۔ سنگدلوں کے پیشواؤں نے پھر بھی یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ یہ محمد کا جادو ہے (ﷺ)۔ مگر اب وہ اپنے اصرار میں کامیاب نہ ہوسکے اور مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ معاہدہ ختم ہوگیا ۔ اس قدرتی کرشمہ کے بعد ایسی فضا ہوگئی کہ بنو ہاشم شعب سے نکل کر مکہ میں آگئے۔ [4]

ایسے سخت امتحان میں روحانی ترقی کہاں تک ہوسکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں ۔ چنانچہ اسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو معراج کا شرف

---

[4] البدایہ والنہایہ ص ۹۶ ج ۳

عظیم حاصل ہوا ۔ معراج میں پنج وقتہ نمازیں فرض ہوئیں ۔ نماز کے آخر میں التحیات پڑھی جاتی ہے جس میں نہ صرف آنحضرت ﷺ اور ان بزرگوں پر جو اس امتحان میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ان کے طفیل میں تمام عباد صالحین پر سلام بھیجا جاتا ۔ السلام علینا وعلیٰ عباداللہ الصالحین

پناہ کی دیواریں منہدم

قریش کا مقاطعہ جو بعثت مبارکہ کے ساتویں سال شروع ہوا تھا تین سال بعد (سنہ ۱۰ بعثت مبارکہ میں) ختم ہوا ۔ چند ماہ بعد رمضان کا مہینہ آیا ۔ اس مہینہ میں چند روز کے فرق سے خواجہ ابوطالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی ۔ سیدہ خدیجہ وہ خاتون تھیں جو سب سے پہلے ایمان لائیں اور ابو طالب وہ شیخ قبیلہ تھے جو آخر تک ایمان نہیں لائے اور یہ اعلان کرتے ہوئے مرے کہ میں نے اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑا۔مگر آنحضرت ﷺ کے دونوں جاں نثار تھے ۔

پناہ کی یہ دونوں دیواریں منہدم ہوگئیں ، تو اب دشمنوں کا راستہ صاف تھا ۔ عقبہ بن ابی معیط اور ابولہب جو بدترین موذی دشمن تھے اور دونوں پڑوسی تھے۔[5] ان کا طریقہ یہ تھا کہ راستہ میں کانٹے بچھوادیتے ۔ دروازہ میں غلاظت کا بھرا ہوا ٹوکرا ڈالوادیتے تھے۔ ان کے چھوٹے ان سے بھی آگے تھے۔ وہ کاشانہ نبوی میں گھس کر

---

[5] ابن سعد ص ۱۳۴ ج ۱ ،

برتنوں کو خراب کرتے ، پکتی ہوئی ہنڈیا کو اوندھی کردیتے یا اس میں پلیدی ڈال دیتے تھے ۔❷

خدا جانے کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضرت ﷺ باہر سے تشریف لائے ، سر مبارک اور کپڑے گرد وغبار اور پلیدی سے آلودہ ، صاحبزادیاں یہ حالت دیکھ کر دلگیر ہورہی ہیں ، کپڑے دھورہی ہیں ، سر مبارک صاف کررہی ہیں ، زبان سے بددعا دیتی ہیں تو ارشاد ہوتا ہے : لاتبکی یابنیة فان اللہ مانع اباک❸ (بیٹی دلگیر نہ ہو اللہ تمہارے باپ کا محافظ ہے)

پناہ کی تلاش :

نبی کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے ، اور شروع میں جب یہ حکم نازل ہوا تھا کہ "اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت اسلام دو"❹ توساتھ ہی حضرت حق جل مجدہ نے یہ ہدایت بھی فرمائی تھی ۔

"بھروسہ کر خدا قادر ورحیم پر جو تم کو دیکھتا رہتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو اور نمازیوں کے ساتھ تمہاری نشست و برخاست کو وہ دیکھتا رہتا ہے"۔❺

مگر چونکہ نبی کی زندگی کا ہر ورق امت کے لئے سبق ہوتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل اور کامل بھروسہ کے باوجود ظاہری ذرائع اور اسباب سے دامن نہیں جھٹکتا ، کیونکہ اگر

❷ البدایہ والنہایہ ص ۱۲۲ج۲
❸ ایضاً
❹ سورہ شعراء آیت ۲۱۴
❺ سورہ شعراء، آیت ۲۱۷ و ۲۱۹

سلسلہ اسباب کو چھوڑ دیا جائے تو اس عالم اسباب کا نظام ہی درہم برہم ہوجائےگا۔ بہرحال جب خواجہ ابو طالب کی وفات کے بعد قریش کو موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ اب تک نہیں کرسکتے تھے اس کو کر گزریں تو آپکو بھی ایسے ذریعے کی تلاش ہوئی جو قانون عرب کے بموجب آپ کے لئے پناہ بن سکے۔

مگر مٹھی بھر مسلمانوں یا آل ہاشم کے علاوہ مکہ کا بچہ بچہ دشمن تھا اور کوئی ہمدرد بھی تھا تو کس کی ہمت تھی کہ قریش کے مقابلہ میں ڈھال بن سکے ۔ لہذا آپ نے مکہ سے باہر نظردوڑائی ۔

طائف کا سفر

طائف :

مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز پہاڑ ہے ۔ نہایت زرخیز ہے وہاں بڑے بڑے باغات اب بھی ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ مکہ کے رئیسوں کی وہاں کوٹھیاں تھیں ۔ قبیلہ ثقیف کا وہاں تسلط تھا۔ وہ عرب کا طاقتور قبیلہ مانا جاتا تھا۔ قریش بھی اس کا لوہا مانتے تھے ۔ اس قبیلہ سے ان کی رشتہ داریاں بھی تھیں ۔

روساءِ طائف اور ان کے اجواب:

تین بھائی عبدیالیل، مسعود،اور حبیب یہاں کے رئیس اعظم اور قبیلہ ثقیف کے سردار تھے۔ آنحضرت ﷺ کی نظر ان پر پڑی کہ اگر وہ پناہ

میں لے لیں تو آپ کو فریضہ تبلیغ کی ادائیگی میں آسانی ہو ۔ چنانچہ آپ رمضان گزرنے کے بعد ماہ شوال میں طائف تشریف لے گئے[1]۔ دس روز وہاں قیام فرمایا ۔[2] عوام و خواص اور ہرایک کے سامنے دعوت اسلام پیش کی۔ روساء اور معززین کے مکانوں پر پہنچ کر گفتگو کی۔[3] ان تینوں بھائیوں سے بھی ملاقات کی۔ اپنا مقصد واضح کیا ۔ مگر کسی ایک نے بھی انسانیت سے جواب نہیں دیا ۔

ایک نے کہا اگر خدا نے تمہیں رسول بناکر بھیجا ہے تو وہ خانہ کعبہ کے کپڑے کھسوٹ رہا ہے (اس کی عزت پامال کررہاہے)۔

دوسرے نے کہا ۔ اللہ کو آپ کے سوا کوئی اور نہیں ملا تھا جس کو رسول بناکر بھیجتا۔

تیسرے نے کہا : واللہ میں تم سے بات نہیں کروں گا ۔ کیونکہ جیسا تمہارا دعویٰ ہے اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو تو رسول کی شان یہ نہیں ہے کہ اس سے بحث کی جائے اور اگر تم خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہو تو میری شان یہ نہیں ہے کہ میں جھوٹے سے بات کروں ۔[4]

ان لوگوں کے بھونڈے جواب سن کر آپ نے فرمایا کہ اتنی مہربانی کروکہ میرے آنے کی خبر کسی کو نہ دو ۔ آپ کو خیال ہوا کہ مکہ والوں کو میرے آنے اور ان کے جوابوں کی خبر ہوگی تو

---

[1] یہ سفر غالباً پاپیادہ ہوا ۔ کسی سواری کا کوئی تذکرہ روایتوں میں نہیں ملتا ۔ محمد میاں

[2] ابن سعد ص ۱۴۲ ج ۱

[3] ایضاً

[4] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۳

وہ اپنی حرکتوں میں اور دلیر ہوجائیں گے۔ مگر ان بدنصیبوں نے اس فرمائش کی تعمیل اس طرح کی کہ طائف کے آوارہ گردوں کو اشارہ کردیا ۔ وہ آپ کے پیچھے پڑگئے اور گستاخیاں کرنے لگے۔ اور جب کسی طرح ان سے جان چھڑاکر آگے بڑھے تو طائف کے لوگوں نے جو دونوں طرف صف بنائے کھڑے تھے ذات اقدس پر دونوں طرف سے پتھر برسانے شروع کردیئے۔ سنگ باری سے پنڈلیاں مجروح ہوگئیں ، گھٹنے چور ہوگئے، بدن مبارک لہولہان ہوگیا۔ایک جاں نثار حضرت زید بن حارثہ ساتھ تھے ، وہ کبھی آگے کبھی پیچھے بچانے کی کوشش کررہے تھے۔ مگر تنہا کیاکرسکتے تھے۔ پتھروں سے ان کا سر بھی پھٹ گیا ۔[1] بالآخر کسی طرح آبادی سے باہر نکلے تو بیہوش ہوکر گر پڑے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اٹھا یا ، قریب ہی کچھ پانی تھا ، وہاں لے گئے تاکہ خون کے دھبے دھوویں ، نعل مبارک اتارنے چاہے تو خون سے اس طرح جم گئے تھے کہ اتار نا مشکل پڑا۔ طبیعت سنبھلی تو قریب کے ایک باغ میں تشریف لے گئے ۔ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے اور اپنے معبود کی بارگاہ میں مشغول دعا ہوگئے ۔[2]

بارگاہ رب العزت میں عجزوانکسار

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۲۴۱ ج ۱

[2] البدایہ والنہایہ ص ۲۳۱ج ۳ ،

پتھر برسانے والوں کے حق میں خیراندیشی اور ہمدردی

اہل طائف کی وحشیانہ حرکتوں سے مجروح و مضروب محمد رسول اللہ ﷺ انگور کی ٹہنی کے سایہ میں نڈھال بیٹھے ہیں ، دل میں درد ہے، زخموں میں ٹیس ، مگر پیشانی بارگاہ رب العزت میں جھکی ہوئی ہے اور زبان مبارک مصروف دعا ہے[3] (ترجمہ یہ ہے)

> "میرے اللہ میں تجھ ہی سے اپنی بے بسی کا شکوہ کرتا ہوں ، میں لوگوں میں ذلیل ہورہا ہوں ، اس کا شکوہ تجھ ہی سے کرتا ہوں ، اے سارے مہربانوں میں سب سے زیادہ مہربان،
>
> ان کا رب (نگران و مدد گار) توہی ہے جو دنیا میں کمزور سمجھے جاتے ہیں ، جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، جن کے پاس وسیلے اور ذریعے نہیں ہوتے اور ہاں میرا رب توہی ہے۔ اے میرے پروردگار تومجھے کن کے حوالے کررہا ہے، ان کے جو مجھ سے دور ہیں ! جو مجھ سے بات بھی کرتے ہیں تو منہ بگاڑ کر، یا ان کو جو میرے دشمن ہیں ، کیا تو نے میرے معاملے کا مالک ان کو بنادیا ہے ؟
>
> اے اللہ !اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے، خدا وند اگر مجھ پر تیرا عتاب نہیں ہے تو

---

[3] غورکیجئے کیا ایسا شخص (معاذ اللہ) کاذب یا ساحر یا شاعر ہوسکتا ہے ؟

مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے ۔
خداوندا تیری عافیت کا دامن بہت وسیع
ہے، میری سمائی تیری عافیت کی گودہی
میں ہے۔

تیرے چہرہ کا وہ نور ہے جس سے
اندھیریاں روشنی بن جاتی ہیں جس کے
ادنیٰ جلوے سے دنیا اور آخرت کے بگڑے
ہوئے کام سنور جاتے ہیں ، میں اسی نور
کی پناہ لیتا ہوں ۔

میں پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھ
پر تیرا غضب پڑے یا عتاب نازل ہو ۔ تجھ
ہی کو منانا ہے اور اس وقت تک منانا ہے
جب تک تو راضی نہ ہو ۔ اے اللہ مجھ
میں نہ طاقت ہے نہ زور ہے۔ جو کچھ
طاقت ہے تیرا ہی صدقہ ہے۔ جو کچھ
قوت ہے وہ تیری ہی عطا ہے۔ میری
کوئی تدبیر کارگر نہیں کارساز توہی ہے
بگڑی کو بنانے والا توہی ہے۔”۔

یہاں سے اٹھے دل غمگین تھا ، حسرت و افسوس کے دھوئیں سے دم گھٹ رہا تھا ، سرجھکائے ہوئے تشریف لے جارہے تھے۔ کچھ دھیان پلٹا تو دیکھاپہاڑی سامنے ہے جس کو قرن الثعالب یا قرن المنازل کہتے ہیں ۔ آپ یہاں ٹھٹکے۔ اوپر نظراٹھی تو دیکھا ایک بادل آپ پر چھایا ہوا ہے ۔ بادل پر نظرڈالی تو دیکھا حضرت جبرائیل امین جلوہ افروز ہیں اور فرمارہے ہیں :

اللہ تعالیٰ نے سن لیا ، دیکھ لیا، تم نے جو کچھ کہا جو لوگوں نے جواب دیا، جس طرح تم کو واپس کیا اور جو سلوک تمہارے ساتھ کیا وہ بھی دیکھ لیا ۔ اب یہ پہاڑوں کے فرشتے (ملک الجبال) موجود ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا ہے ۔ اب حکم کیجئے یہ تعمیل کرینگے ۔

پھر ملک الجبال سامنے آیا ، سلام عرض کیا پھر کہا :

یا محمد تمہاری قوم کی تمام باتیں خدا نے سنیں ، دیکھیں ، اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے آپ جو چاہیں حکم کریں میں تعمیل کروں گا ۔ آپ حکم دیں مکہ کے دونوں طرف جو پہاڑ ہیں ان کو ملاکر ان تمام گستاخ بے ادب لوگوں کو پیس ڈالوں ۔

ایک آزمائش وہ تھی کہ اہل طائف ہرطرف سے پتھر برسارہے تھے۔ دوسری آزمائش یہ ہے کہ جبرائیل امین اور ملک الجبال ان سب کو پیس ڈالنے کی فرمائش کے منتظر ہیں ۔ وہ امتحان تھا صبر وضبط ، تحمل اور استقلال کا ۔ یہ امتحان ہے وسعت ظرف ، فراخی حوصلہ اور دعویٰ رحم و کرم کا۔

جس خدا نے آپ کو اس امتحان میں ثابت قدم رکھا ۔ اس نے آپ کو اس امتحان میں بھی کامیاب فرمایا ۔

فرشتے کی درخواست سن کر دل مبارک

بیتاب ہوگیا ہ یہ خدا کی مخلوق جو نبی کی کھیتی ہے برباد کردی جائے ؟

آپ نے فرشتوں کو جواب دیا :

ارجو ان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ ولا یشرک بہ شیئاً*

اگر یہ بدنصیب راہ راست پر نہ آئیں تو ان کی نسل سے میں ناامید نہیں ہوں ۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی نسل میں وہ ہوں گے جو خدا واحد کی عبادت کرینگے اور شرک سے باز رہیں گے۔[1]

باغ کے مالک اور ان کا غلام:

یہ باغ عتبہ[2] اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا جو مکہ کے مشہور رئیس تھے۔ یہ دونوں بھائی باغ میں موجود تھے۔ انہیں غیرت آئی کہ شہر کے ایک شخص کے ساتھ طائف والوں نے یہ سلوک کیا ۔ مگر یہ ہمت پھر بھی نہیں ہوئی کہ آنحضرت ۔ سے آکر بات کرتے ۔ انگوروں کے خوشے تھالی میں

---

* بخاری شریف ص ۴۵۸ مسلم شریف ص ۱۰۹ ج۱

[1] حضرت نوح علیسلم کو اس کی توقع نہیں تھی آپ نے بارگاہ رب العزت میں یہ عرض کیا تھا انک ان تذرھم یضلواعبادک ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً ۔ (سورہ نوح۔۲۷ " اگر ان کو مہلت رہی تو یہ بندگان خدا کو گمراہ ہی کرینگے۔ اور صرف انہیں کو جنم دینگے جو بدکار اور بدترین کافر ہونگے")

[2] یہ حضرت معاویہ ضی اللہ عنہ کے نانا ، حضرت ابوسفیان کے خسر تھے، غزوہ بدر میں سب سے پہلے یہ دونوں بھائی اور عتبہ کا لڑکا ولید بن عتبہ ہی حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث ضی اللہ عنہم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے ۔ تفصیل سلسلہ غزوات میں ملاحظہ فرمائیے ۔

رکھ کر غلام کو دیئے کہ وہ ان مظلـوم مہمـانوں کے پاس لیجائے جو سایہ میں بیٹھے ہوئے ہیں ۔

غلام کا نام عدا س تھا ، مذہباً عیسائی تھـا ۔ وہ آپ کے پاس انگـور لے کـر آیـا۔ آپ نے انگـوروں کی طـرف ہاتھ بڑھایـا تـو زبـان مبـارک پـر آیـا : بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

عداس الرحمن الرحیم سن کر چونکا، کہنے لگا : یہاں کے آدمی تو الرحمن الرحیم نہیں کہتے ۔❸

آپ نے فرمایــــا: تم کہاں کے ہو؟ عــــداس نے جواب دیا: میرا آبائی وطن "نینویٰ" تھا۔

آنحضرتﷺ : وہی نینویٰ جو میرے بھائی یونس (علیسلم) کا وطن تھا ۔

عداس: آپ حضـرت یـونس علیسـلم کـو کیسـے جانتے ہیں ؟

آنحضــرت ﷺ نے جــواب دیـا : مــیرے اور ان کے درمیان نبوت کا رشتہ ہے وہ بھی اللہ کے نبی تھے ۔ میں بھی اسی خدا کا بھیجا ہوا نبی ہوں ۔

عـداس یہ سـن کـر تـڑپ گیـا ۔ آنحضـرتﷺ کے ہاتھ پیر چومنے لگـا ۔ عتبہ اور شـیبہ نے دور سـے دیکھا تو کہنے لگے اس کو تو محمد نے بگاڑ دیا ۔

جب عداس واپس پہنچا تو دونـوں بھـائیوں نے غلام سے پوچھا : تم یہ کیا حرکت کررہے تھے ؟

عداس : یہ نبی ہیں ان سـے بہتر کـوئی آدمی نہیں ۔ انہوں نے مجھے دو بـاتیں بتـائیں جـو نـبی ہی بتاسکتا ہے ۔

---

❸ ملاحظہ فرمـائے سـورہ ۲۵ الفرقـان کی آیت ۶۰ جب ان مشرکین مکہ سے کہاجاتا ہے کہ سـجدہ کـرو رحمن کـو تـو وہ (انجان بن کر کہتے ہیں) رحمن کون ؟۔

دونوں رئیس : اس کی باتوں میں نہ آؤ اپنے مذہب پر رہو ۔ تمہارا مذہب اس کے دین سے بہت اچھا ہے ۔[1]

مطعم بن عدی کی قدردانی :

طائف میں یہ سب کچھ ہوا ۔ مگر وہ سوال پھر بھی رہ گیا، جس کے لئے آپ نے یہ سفر اختیار کیا تھا ۔ آپ نے مکہ پہنچنے سے پہلے یکے بعد دیگرے روساءمکہ اخنس بن شریق اور سہیل بن عمرو کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ حمایت کا وعدہ کرلیں مگر دونوں نے انکار کردیا کہ وہ قریش کے حلیف ہیں ۔ وہ قریش کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے ۔ پھر آپ نے اس کے پاس پیغام بھیجا جس کے لئے یہ شرف مقدر تھا ۔

یہ رئیس مکہ مطعم بن عدی تھا ۔ اس نے حمایت کا وعدہ بھی کیا اور یہ فرمائش بھی کی کہ آپ اس کے یہاں تشریف لائیں ۔

آنحضرت ﷺ مطعم کے یہاں تشریف لے گئے ۔ رات ان کے یہاں گزاری، صبح ہوئی تو مطعم نے خود ہتھیار سجائے ۔ اس کے چھ سات لڑکے تھے سب کو مسلح کیا، پھر آنحضرت ﷺ کو لے کر چلا ۔ حرم کعبہ میں پہنچا۔ آنحضرت ﷺ سے کہا آپ طواف کریں ۔ آنحضرت ﷺ نے طواف کیا ۔ مطعم اور بیٹے حفاظت کرتے رہے۔ جب طواف سے فارغ ہوئے تو مطعم نے اعلان کردیا کہ "محمد ﷺ میری پناہ میں ہیں ۔"

ابوسفیان، مطعم بن عدی کے پاس آیا دریافت

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۶ ج ۳

کیا : تم نے محمد کو اپنی پناہ میں لیا ہے یا ان کا مذہب قبول کرلیا ہے ؟ مطعم نے جـواب دیـا میں نے مذہب نہیں بدلا صرف محمد کـو پنـاہ دی ہے۔ ابــو ســفیان نے کہا : تب آپ کے اعلان کـا احــترام کیاجائے گا ۔❷

---

❷ البدایہ والنہایہ ص ۱۳۷ ج ۳